U32994 Date 30

Title - CHOTEIN

Creator - Ismat Chughtai.

Publisher - Saaqi Book Dipo (Delhi).

Date - 1942.

Pages - 240

Subjects - Urdu Adab - Afsane

# چوٹیں



از

عصمت چغتائی
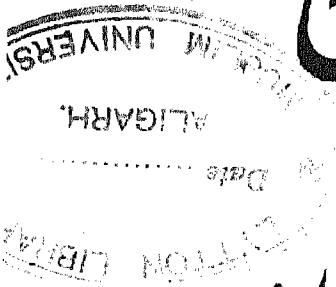
ناشر:-

ساقی بکڈپو دہلی

مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی

باراول ——— قیمت دو روپے

# فہرست

# پیش لفظ

میں جب عصمت چغتائی کے افسانوں کا تجزیہ کرنے بیٹھتا ہوں تو ایک عجیب دشواری پیش آتی ہے، ان کے افسانے عام شاہراہ سے ہٹ کر ایک اور ہی نہج اختیار کر چکے ہیں، ان کی حیثیت اس قدر مختلف اور منفرد نظر آتی ہے کہ ان پر عام ادبی اقدام کا اطلاق کرتے ہوئے کچھ دقّت سی محسوس ہوتی ہے عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پُر پیچ اور دشوار گذار نظر آتے ہیں۔ میں شاعری نہیں کر رہا۔ اور اگر اس بات میں کوئی شاعری ہے تو اسی حد تک جہاں تک شاعری کو سچی بات میں دخل ہوتا ہے۔ مجھے یہ افسانے اُس جوہر کے منشا معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے، اسکی روح میں ہے۔ اس کے دل میں ہے اس کے ظاہر میں ہے، اس کے باطن میں ہے۔ یہ افسانے شاید "تل" کی ہیروئن "رانی" کے جسم کی طرح ہیں۔ اور جب کبھی اس جوہر کو پرکھنے، اسے عام ادبی اقدار میں ڈھالنے اور کلیوں میں پھانسنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ جوہر ایک نظر نہ آنیوالے غیر مرئی ہیولی کی طرح قابو میں نہیں آتا۔ اور "تل" کے ہیرو "چودھری" کے الفاظ میں:۔

"سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ وہ ہزاروں رنگ لتھیڑنے پر بھی وہ اس کے جسم جیسا مسالہ تیار نہ کر سکا۔ اس نے سیاہی میں صندلی گھول کر اس میں ذرا سا نیلا رنگ ملا دیا۔ پھر بھی اس کے رنگ کی چمک آبنوسی، صندلی، نیلی اور کچھ بادامی لہر لئے ہوئے تھی۔ ایک مصیبت ہوتی تو خیر تھی۔ آج اس کا رنگ سرمئی ہوتا تو دوسرے دن اس میں شفق کی سی سرخی پھوٹنے لگتی۔ اور پھر کبھی بالکل اچانک

اس کا جسم ختم ہوتی ہوئی رات کی طرح کچھ اُودی اُودی گھٹاؤں سے ملنے لگتا اور کبھی نہ جانے کہاں سے اس میں سانپ کے زہر کی سی پیلاہٹ جھلکنے لگتی . . . اور آنکھیں بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتیں۔ اس نے پہلے دن نہایت اطمینان سے کولتاری سا سیاہ رنگ گھول کر تیار کیا لیکن پھر اسے پُتلی کے گرد لال لال ڈورے نظر آئے۔ خیر وہ بھی ہوئی پھر ان ڈوروں کے آس پاس کی زمین بادلوں کی طرح نیلی معلوم ہونے لگی۔ وہ جھنجلا گیا اور ڈھیر سارنگ بیکار کیا لیکن اس کے غصے کی جب تو انتہا ہی نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ذرا سی دیر میں وہ سیاہ کولتار جیسی پُتلیاں سبز ہونے لگیں اور ہوتے ہوتے وہ زمرد کی ڈلیوں کی طرح ناچنے لگیں۔ پتلیوں کے آس پاس کا میدان دُودھیلا سفید ہو گیا اور ڈورے قرمزی ہو گئے۔"

یہی گوناگوں بوقلموں رنگارنگی، ان کی متلون مزاجی، پرپیچ تو اثر اور سحر انگیز مشاطگی جسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن شاید اتنی شدّت سے بیان نہیں کیا جاسکتا ان افسانوں کا جوہر عظیم ہے۔

پہلے پہل جب میں نے عصمت چغتائی کے افسانے پڑھے تو مجھے یوں معلوم ہوا گویا میرے ذہن کی چار دیواری میں ایک نیا دریچہ کھل گیا ہے۔ یہ دریچہ جو میرے ذہن، شعور اور ادراک کی دنیا میں ایک نئے منظر میں اضافہ کرتا ہے۔ میں نے اس منظر کی جزئیات کو گاہے گاہے دیکھا تھا۔ اس کے کرداروں کا بھی فروعی مطالعہ کیا تھا۔ ان کی خوشیوں اور غموں کو اک اڑتی اچھلتی ہوئی نظر سے دیکھا بھی تھا لیکن کبھی اس سارے منظر کو، اس کی تمام جزئیات کو، ان تمام کرداروں کو ان کی تمام خوشیوں اور غموں کے ساتھ اس قدر متناسب اور مکمل نہ پایا تھا۔ جو چیز کبھی قاشوں میں ٹکڑوں میں چھوٹی چھوٹی جھلکیوں میں دیکھی تھی وہ آج ایک مکمل تصویر کی صورت میں نظر آئی۔ یہ تصویر خوبصورت بھی تھی، بدصورت بھی۔ اس میں آنسو بھی تھے اور قہقہے بھی۔ زندگی کی

گہرائی بھی اور اس کا چھچھور اپن بھی، نفرت بھی اور مرمٹ جانے کے آثار بھی جو کسی عورت ہی کو نصیب ہو سکتی ہے۔ اور پھر میرے اچھیرے، خلیرے بھائی بہن، ان کی چاہتیں ان کی رسوائیاں، لگاوٹیں، جلاوتیں۔ اس تصویر میں ایک مسلم گھرانے، ایک متوسط طبقے کے شہری مسلم گھرانے کی روح کھنچ آئی ہے۔ اس قدر صاف واضح کہ نقش اوّلیں ہی نقش آخر معلوم ہوتا ہے۔ نئے افسانہ نگاروں میں دو ایک اور نے بھی اس تصویر کو پیش کیا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ نہایت عمدہ طریق سے پیش کیا ہے اور عصمت چغتائی سے پہلے پیش کیا ہے لیکن انھوں نے اسے ایک مرد کے زاویۂ نگاہ سے جانچا ہے اس لئے چند جزئیات غیر متناسب ہیں چند خطوط غیر متوازی ہیں کیونکہ مرد اکثر گھر کی چہار دیواری سے باہر رہتا ہے اور متوسط طبقے کے شہری مسلم گھرانے کی بہو بیٹی اکثر گھر کی چہار دیواری ہی میں زندگی بسر کرتی ہے۔ یہ گھر اس کی روح کا ملجا و ماوا ہے۔ اس کی فکری، روحانی جسمانی زندگی کا مرکز ہے۔ اسی لئے تو عصمت کے افسانوں میں اس گھرانے کا حال اس قدر شدت تاثر کے ساتھ مرقوم ہے کہ پڑھنے والے کو افسانہ کے ماحول اور اس کے کرداروں سے ایک روحانی قرابت کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ ان کے دکھوں، تکلیفوں اور مسرتوں کو انھیں خوشیوں اور صعوبتوں سے اس قدر ہم آہنگ کر لیتا ہے کہ کوئی حدِ فاصل نہیں رہتی۔ یہاں کرداروں کا ماحول اور ان کی زندگی اس کی زندگی سے ملو معلوم ہوتے ہیں۔ اور وہ متوسط طبقے کا مسلم گھرانا، اس کا اپنا گھر۔ اس لحاظ سے عصمت چغتائی کے افسانے بہت کامیاب ہیں۔

ان افسانوں کے مطالعے سے ایک اور بات جو ذہن میں آتی ہے وہ ہے گھوڑ دوڑ۔ یعنی رفتار، حرکت، جھمک خرامی اور تیز گامی۔ نہ صرف افسانہ دوڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے، بلکہ فقرے، کنائے اور اشارے اور آوازیں اور کردار اور جذبات اور احساسات ایک طوفان کی سی بلاخیزی کے ساتھ چلتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔ اور کبھی کبھی پڑھنے

والے کا ذہن اس قدر پیچھے رہ جاتا ہے کہ دل ہی دل میں وہ افسانہ نگار کو کوستا رہ جاتا ہے یعنی عورت ہوکر بھی اس قدر بھاگم دوڑ کیوں ؟ ہمیں یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے۔ سچ ہے یہ احساس شکست اور وہ بھی عورت کے ہاتھوں سے کیسے اچھا لگتا ہے۔ لیکن یہ بلاخیزی، تندرستی اور توانا انسان کیلئے صدائے جرس سے کم نہیں۔ اٹھو، کام کرو، جاگو، بیدار ہو۔ ہندوستان کی عورت اپنی روح میں بیداری اور بیداری کے ساتھ نسیم صبح گاہی کی تازگی اور توانائی محسوس کر رہی ہے۔ وہ عہد کہن کی تمام کلفتوں کو مٹا کر ایک نئی حرکتی زندگی کا آغاز کرنا چاہتی ہے۔ ان افسانوں کے ذہنی تسلسل کی تیز رفتاری اس نئی زندگی کے خارجی پہلو کی آئینہ دار ہے "بیمار" میں۔

"اور پھر دندناکر بخار چڑھتا اور گنگھی بندھ جاتی۔ معلوم ہوتا ہڈیاں چیخ رہی ہیں۔ اور کھال جھلسنے لگتی۔ گلے میں جیسے رہٹ چلنے لگتا۔ چوں چر۔ شڑرو۔ کھڑ۔ اور پھر کھانسی کے پھندے پڑنے لگتے۔

بچے آنگن میں کلکاریاں مارتے اور ایسا معلوم ہوتا گویا اس کے کلیجے پر گھن برس رہے ہیں۔ بس وہ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے دروازے دھڑ دھڑاتے نکل جاتے۔ اور اس کی زندہ لاش سر سے پیر تک لرز جاتی اور پھر دوسری آوازیں بھیانک بھونپو والی لاریاں، کوکتی ہوئی موٹریں، کھڑکھڑاتے تانگے اور منمناتی ہوئی سائیکلیں سب گویا اس کے سینے پر سے دندناتی گذرتیں "رام رام ست ہے!" اسکا کلیجہ مسل جاتا۔"

"ٹمن ٹمن کوئی کالج کی لڑکی سائیکل اڑاتی آرہی تھی۔ خواب پھر بدلے۔ کیا عجب سائیکلیں ٹکرائیں جیسے ستارے ٹکراتے ہیں۔ اور پھر طوفان . . . گرج اور چمک بیہوش حسینہ . . . مگر . . . وہ بریک . . . بریک لگا ہی نہیں۔ ایک ستارہ کا دوا دیوالہ نکل گیا۔ ایک گرا دھم سے۔ گھٹنوں پر سے پاجامہ مسک گیا۔ گٹے چھل گئے۔

دو دھکے ستارے کی ساری ڈور موڑ پر ہوا میں لہرائی اور گم ۔“ (اس کے خواب)

میرے خیال میں کوئی حادثہ بھی اس برقی رفتاری سے وقوع میں نہیں آتا کہ جس طرح عصمت چغتائی نے اسے بیان کیا ہے ۔ سرعت ، حرکت ، رفتار مختصر افسانہ کا ایک اہم جزو ہے اور اس لحاظ سے مجھے اپنے کئی افسانے ٹھس معلوم ہوتے ہیں ٹھیرے ہوئے پانی کی طرح رُکے ہوئے ۔

”کاش اس کا بس چلتا تو وہ بتاتا منحوس لڑکی ۔ بڑی علم حاصل کر رہی ہیں ۔ کچھ نہیں ۔ کچھ پڑھنے وڑھنے کی ضرورت نہیں جنگلی . . . . ان سے سادھو کی لڑکی ہی ہزار بلکہ کروڑ درجہ اچھی تھی ۔ دودھ تازہ چمکتی ہوئی پیتل کی لٹیا میں باچھوں میں بہہ رہا ہے ۔ اس سے تو وہ سڑک کوٹنے والی ہی اچھی گو اس کی کھال جھلس کر سائیکل کی گدی سے ملنے لگی ہے اور پنڈلیاں پھوڑوں سے لدی ہوئی ہیں اور دو منٹ پاس بیٹھ جاؤ تو جوئیں بلبلانے لگیں ۔ مگر ذرا آنکھ جھپکاؤ مسکراہٹ کی بجلیاں تیار ۔“ (اس کے خواب)

”ایک الماری کے بالائی تختے پر ایک گھڑی رکھی ہے ۔ چوڑی سی موٹی عورت کے چہرے کے مانند ۔ کڑک مرغی کی طرح کٹاک کٹاک کرتی رہتی ہے ۔ یہ گھڑی اس گھر میں بالکل مالکہ مکان کی حیثیت رکھتی ہے ۔ جونہی دس بجتے ہیں گائے سینگ بدلتی ہے ۔ نظام فلکی میں تبدیلی ہوتی ہے ۔ کرسی کا پتلون ایک سپاٹے سے غائب ہو جاتا ہے ۔ پائے پر رکھی ہوئی پسینہ دار کھوری ایڑی بھد سے زمین پر آ رہتی ہے ۔ کپڑوں کی جھٹک پھٹک سنائی دیتی ہے گویا فرشتے پھڑپھڑا رہے ہوں ۔ پھر زمین پر جوتیاں رینگنی شروع ہوتی ہیں ۔ . . . . . . . . . . . . . . . . . .

. . . معلوم ہوتا ہے پوری باٹا کمپنی کے جوتے پڑے مچل رہے ہیں ۔ جوتوں کی کھسر گھس سے آپ کے دانت کھسکھسا اٹھتے ہیں جیسے ان کے درمیان کوئی ریت کی چٹکیاں

پھڑک رہا ہو" (جھڑی میں سے)

اور یہ راحت کی شان میں :-

"راحت! آپ نے چند موم کی پتلیوں کو تو دیکھا ہوگا۔ ننھی منی کھیل کود کی شوقین جن کا مقصد زندگی کھیلنا ہے۔ گڑیوں سے کھیلنا، کتابوں سے کھیلنا۔ اماں، ابا سے کھیلنا اور پھر عاشقوں کی پوری پوری ٹیم سے کبڈی کھیلنا۔ ابھی میری بدنصیب بھائی کے ساتھ ہلس کھیل کر آرہی تھی للہ (جنازے)

"مکھیوں کی چہلوں سے دکھی ہو کر آخر بڑھیا بھڑبھڑا ہی اٹھی۔ یہ مکھی ذات جی کے ساتھ لگی تھی۔ پیدا ہوتے ہی گھٹی کی چپچپاہٹ سونگھ کر جو مکھیاں منہ پر بیٹھنا شروع ہوئیں تو کیا سوتے کیا جاگتے بس آنکھ ناک اور ہونٹوں کی طرح یہ بھی جسم کا ایک عضو بن کر ساتھ ہی رہتی تھیں۔ اور ایک مکھی تو نہ جانے سالہا سال سے اس کی دشمن ہو گئی تھی۔ جب لکھنو میں تھی جب کاٹا۔ پھر جب آناؤ گئی تو برسات میں پھر کاٹا اور لوسندیلہ میں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اگر بڑھیا کو معلوم ہوتا کہ اسے اس کے جسم کے کو لنے مخصوص حصہ سے الفت ہے تو وہ ضرور وہ حصہ کاٹ کر مکھی کو دے دیتی۔ مگر وہ تو ہر حصہ پر ٹہلتی تھی۔ وہ کبھی کبھی غور سے اس خاص کٹ کھنی مکھی کو دیکھتی۔ وہی چتلے پر، ٹیڑھی ٹانگیں اور مٹکا سا سر۔ وہ بڑے تاک کر پنکھے کا چھپا مارتی۔ مکھی تھن تھن کر کے رہ گئی" (تماس)

ان ٹکڑوں کو بلند آواز سے پڑھئے اور بیان کی صوتی رفتار کا بھی اندازہ لگائیے۔

لیکن افسانہ میں اگر رفتار ہی رفتار ہو، سمت نہ ہو، نہج متعین نہ ہو تو افسانہ ایک وحشی ہرنی کی چوکڑی بن کر رہ جاتا ہے۔ "کیوں رے کتے" کی پڑوسن برجو کی طرح جو الھڑ اور لاابالی ہے اور جو زندگی کے دھارے پر آپ ہی آپ بہے چلی

جارہی ہے۔ اور جیسے نہ اس کی رفتار کا انداز ہے نہ سمت کا۔

"پلنگ کی ادوانوں اور بانوں کے جھینگوں کا ذکر ادھ سنا ہی چھوڑ کر وہ برامدے میں آگئی۔ باہر پڑوسن کے دو بچے کھڈیوں پر بیٹھے کسی نہایت دلچسپ مسئلہ پر لڑ رہے تھے۔ ڈوڈا ایک گائے کھڑی کوڑا کھا رہی تھی ۔ برجو الجھ کر برآمدہ میں رکھے ہوئے گملوں کو دیکھنے لگی ۔ دو ایک خوش رنگ پھول توڑ کر اس نے اپنی لمبی چوٹی کے بالائی سرے میں اڑس لئے اور نیچے کیاریوں میں سے دھنئے کی ننھی ننھی پتیاں توڑ کر سونگھنے لگی ۔ بڑے سکھڑاپے میں آکر اس نے منڈیر پر اُگی ہوئی بیکار گھاس کو نوچ کر الگ کر دیا۔ (کیوں رے کتے)

یہاں برجو کے داخلی اور خارجی افعال کی کوئی سمت نہیں۔ وہ یوں ہی اکتائی ہوئی سی گھوم رہی ہے ۔ اور اگر اس طرح افسانہ بھی کسی سمت کے بغیر گھومنے لگے تو افسانہ کے سب اجزائے ترکیبی پریشان ہو جاتے ہیں۔ اور نتیجہ ایک اچھے افسانے کی صورت میں نہیں بلکہ ایک ذہنی انتشار کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ بظاہر جب عصمت چغتائی کا کوئی افسانہ شروع کیا جائے تو یہی انداز ہوتا ہے کہ اس کمبخت افسانہ کی کوئی سمت نہیں " اس کے محور کا کوئی پایہ سیدھا نہیں " لیکن جوں جوں افسانہ پڑھتے جائیے اس چوکڑیاں بھرتی ہوئی وحشی ہرنی کی سمت واضح ہوتی جاتی ہے۔ وہ عام افسانوی رہگذر سے ہٹ کر ایک نئے جنگل میں جارہی ہے ۔ ایک نئے مرغزار میں ، نئے اشجار ، نئے طیور ، نئے افق کہ آدمی یکایک ٹھٹک کر رہ جاتا ہے کبھی کبھی تو افسانہ کے قریب اختتام ہونے تک اس کی سمت کا پتہ نہیں چلتا پھر یکایک سارا افسانہ اس تیزی سے گھوم کر حرف مطلب پر واپس آتا ہے کہ یکایک پڑھنے والے کی حیرت مسرت میں مبدل ہو جاتی ہے ۔ ساری جزئیات صحیح ، روشن ، متناسب اور برمحل معلوم ہوتی ہیں ۔ جذبات کردار سے اور کردار ماحول سے ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں۔

اس قسم کی فنی صناعی کی بہترین مثال "بھول بھلیاں" ہے۔ بھول بھلیاں کے اس جنگل میں پڑھنے والا فکری اعتبار سے بار بار بھٹکتا ہے۔ اس کے درختوں اور جھاڑیوں سے بار بار الجھتا ہے۔ چیختا ہے، چلّاتا ہے، کوسنے دیتا ہے۔ نہ صرف فکری اعتبار سے بلکہ خارجی نقطۂ نگاہ سے بھی عصمت چغتائی نے اس افسانہ کی انشا میں اس کے فقروں کی نشست و برخاست میں اس کے مختلف نثری ٹکڑوں کی تدریجی ارتقا میں اس صناعی کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ اور سب سے آخری افسانہ کے آخری چند فقروں میں جب حرفِ مطلب ایک بجلی کی لپک کی طرح کوندتا ہے افسانہ کی نہج مکمل طور پر روشن ہو جاتی ہے۔ سمت کو چھپا لینے میں، پڑھنے والے کو حیرت و اضطراب میں گم کر دینے میں، اور پھر یکایک آخر میں اس اضطراب اور حیرت کو مسرت میں مبدل کر دینے کی صنعت میں عصمت اور منٹو ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ اور اس فن میں اردو کے بہت کم افسانہ نگار ان کے حریف ہیں۔

پھر یہ سمت کیا ہے؟ کیا یہ سمت معکوس تو نہیں۔ کیا یہ آگے بڑھنے کے "ماضی کی طرف لوٹو" کی پیغامی علامت تو نہیں۔ کیا عصمت اردو کے کئی ایک افسانہ نگاروں کی طرح رومان کے مرمریں قصر میں محبوس ہو جانا پسند کرتی ہیں۔ جہاں ماضی کی ہر چیز اجلی اجلی، نکھری اور سونے کی طرح خوبصورت اور شفق کی طرح گلگوں نظر آتی ہے۔ لیکن عصمت چغتائی کے یہاں عہدِ کہن کی وہ دھندلی دھندلی میٹھی میٹھی یاد نہیں جو قدامت پرستوں کی آنکھوں کو ڈبڈبا دیتی ہے۔ اور وہ ایک سسکی لیکر نمناک آواز میں کہہ اٹھتے ہیں۔ آہ، وہ کیا زمانہ تھا، وہ کافوری شمعیں، وہ چلمن کی اوٹ، وہ مینائے نازک وہ ساقی بجلوۂ دشمنِ ایمان و آگہی یا رومان پرستوں کی وہ تخیل آفرینیاں جن پر بقول مولانا صلاح الدین "حقیقت خندہ زنی کرے اور شاعر اپنا سر پیٹے"۔ عصمت چغتائی کے ہاں اس قسم کی پیغامیت اور جذباتیت نہیں۔ وہ پرانی قبروں کی پرستش نہیں

کرتیں۔ جیتے جاگتے افسانوں کی کہانیاں سناتی ہیں۔ وہ ارمان کے تخیلی ہیولے تیار
نہیں کرتیں، بلکہ حقیقت کو اپنے تخیل کی شفاف آگ میں پگھلا کر اپنی زبان کے تیز و تند
اور تلخ تیزاب میں اتار کر ایسے جاندار مرقعے تیار کرتی ہیں کہ جہاں پڑھنے والا افسانہ
نگار کی چابک دستی اور فن کاری کی داد دیتا ہے۔ وہاں اپنی اور اپنے سماج کی شکل
پر ببسور تا رہ جاتا ہے۔ اس لئے مجھے بیحد خوشی ہوتی ہے جب لوگ عصمت چغتائی کو
گالیاں دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ دراصل اس وقت اپنے آپ کو گالیاں دے رہے
ہوتے ہیں، اپنی اس مکروہ عفونت کو جسے وہ روحانیت کی خوشبوئیں لگا کر چھپانا چاہتے
ہیں۔ اس جنسی بھوک کو جسے عصمت نے جگہ جگہ اپنے افسانوں میں عریاں کیا ہے اور
جسے یہ سماج ایک جھوٹی شرافت اور مذہبیت کی تہوں کے نیچے چھپا کر رکھنا چاہتا ہے،
عصمت نے جگہ جگہ سماج کی اس مکاری اور ابلہ فریبی کو بے نقاب کیا ہے۔ اور ایک
ایسی بے پناہ طنزیہ انداز نگارش سے کام لیا ہے جو برمے کی طرح چھیدتی چلی
جاتی ہے۔ 'دوزخی' میں خود عصمت نے اس طرز نگارش کے اسباب پر روشنی
ڈالی ہے۔

"دنیا بدل گئی ہے، خیالات بدل گئے ہیں۔ ہم لوگ بدزبان ہیں اور منہ
پھٹ، ہم دل دکھتا ہے تو رو دیتے ہیں۔ سرمایہ داری، سوشلزم اور بیکاری
نے ہم لوگوں کو جھلس دیا ہے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں دانت پیس پیس کر لکھتے ہیں۔ اپنے
پوشیدہ دکھوں، کچلے ہوئے جذبات کو زہر بنا کر اگلتے ہیں۔" (دوزخی)

"یہ جی ہاں، اینچر ہو گیا شاید۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"واقعی!" وہ بے ہنگم سا لمبا انسان مذاق اڑانے کے لہجے میں بولا۔

"جی ہاں کوئی کانٹا چبھ گیا شاید!" میں نے معصومیت کی دال نہ گلتے دیکھ کر
اونچی اور کھری آواز میں کہا۔

"واقعی!" پھر وہی کمینہ، متمسخرانہ گفتگو۔ کاش، کوئی اسے خواتین سے گفتگو کرنے کا سلیقہ سکھاتا۔ (کاش کبھی ہندوستانی نوجوان خواتین سے اس غیر رومانی انداز میں گفتگو کر سکتے)

"اس سے آپ کا مطلب؟"

"یہی کہ شوق ـــ آپ لوگوں کو ذرا شوق ہوتا ہے کہ جہاں کوئی رومینٹک جگہ دیکھی اور کوئی حادثہ لے بیٹھیں۔ پنکچر ہو رہے ہیں۔ دریا میں ڈوبی جا رہی ہیں، بدمعاش لئے جاتے ہیں۔ جہاں دیکھو ـــ" (پنکچر)

اور ایک کنوارے اسکول ماسٹر کے جنسی خواب جن میں شاید سیکڑوں افسانوں کے آغاز اور انجام کروٹیں لے رہے ہیں۔

"خواہ وہ جنگل کتنا ہی حسین اور سریلا کیوں نہ ہو، یہ لازمی ہے کہ وہاں ایک حسین لڑکی ہو، بے حد حسین، بھلا سادھو کی لڑکی جنگل میں دریا کے کنارے کنول توڑ رہی ہو اور سیاہ کھُنری اور چپٹی ہو، تو بے اختیار یہی جی چاہے گا کہ چڑیل کو پانی میں ڈبو دو۔

خیر تو اس کے جنگل کے سادھو کی لڑکی بھی حسین ہوتی۔ اب یا تو وہ گھوڑے پر سے گر پڑتا اور وہ لڑکی اس کا سر زانو پر رکھ کر ہوش میں لاتی، یا پھر وہ پیاسا ہوتا اور کُٹی میں جاتا، اور سادھو اپنی حسین منورما، آشا یا روپا جو کچھ بھی ہوتی اسے پکارتا۔ اور وہ بجلیاں گراتی آنچل کے شعبدے دکھاتی آتی اور لٹیا گلاس میں تازہ بکریوں کا دودھ دوہ کر لاتی۔ شرمانا اس کیلئے ضروری ہوتا۔ اور اس کے جسم میں بجلی کوندانے کو اس کی پتلی انگلیاں شرطیہ طور پر چھو جاتیں۔ اور جب یہ معاملہ ہو تو انجام معلوم ہی ہے۔"

عصمت کے ہاں موضوعات کی کمی نہیں "کیوں لے کے" اور "بن بلایا

مہمان" ہندو مسلم مناقشات پر روشنی ڈالتے ہیں۔" ایک شوہر کی خاطر"
اور" سفر میں" ریل کے ڈبوں سے متعلق طنزیہ خاکے ہیں۔" بیمار" میں سِل
کے ایک قریب المرگ مریض اور اس کی نوجوان بیوی کا نفسیاتی موازنہ ہے۔
"تل" میں ایک ادھیڑ عمر کے مصور اور اس کی ماڈل بھکارن رانی کے دو متضاد
اور مخالف کردار پیش کیے گئے ہیں۔ جس میں" آرٹ" اور" جنس" کے تاثرات
لاشعور کی لہروں پر متصادم اور" دست وگریباں" نظر آتے ہیں۔" بچھو" اور
"بھول بھلیاں" محبت اور معاشری شادی سے متعلق ہیں۔ ان دو افسانوں
میں عصمت چغتائی کی پیغامیت روایتی شادی پر محبت کو اور رسمی ایجاب و
قبول پر دلی رفاقت کو ترجیح دیتی نظر آتی ہے۔" لحاف" میں یہ بتایا گیا ہے
کہ اگر ایک نوجوان اور شریف عورت ایک بیجڑے خاوند کے پلے باندھ دی
جائے تو وہ اپنی زندگی کس طرح گذارتی ہے (یہ افسانہ پڑھ کر اکثر لوگ
چونک پڑتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں ؟)

" ساس" میں وہی ازلی، ابدی، دوامی ساس ہے جو ہندوستان کے
ہر گھر میں موجود ہے۔ اور جس کی شفقت اور جس کا غصہ اور جس کی کھاؤں
کھاؤں ہر زنانہ میں شب و روز گونجتی ہے۔" دوزخی" شخصیت سے قطع نظر،
ایک دائم المریض ہستی کے کردار کا مطالعہ ہے۔ اور اتنا سچا، اتنا جھوٹا۔
اتنا بے رحم، اتنا نرم و نازک، اتنا پیارا اتنا برا، اتنا خوبصورت اسکیچ اردو
میں اور لکھا ہی نہیں گیا۔ لیکن موضوعات کی اس فراوانی کے باوجود یہ کہنا
پڑیگا کہ عصمت چغتائی کے افسانوی جوہر کا مرجع ایک متوسط طبقے کا گھر ہے۔
یہاں مزدور اور کسان نہیں بستے۔ نہ ہی سیٹھ اور سر اور خان بہادر۔ اس میں
مذہبیت بھی ہے اور گھٹا گھٹا ماحول بھی۔ پردہ بھی ہے اور نہیں بھی ہے،

شرم بھی ہے اور بیباکی بھی، کالج کی لڑکیوں کی چہلیں ہیں اور بہو اور ان کی ننھی، ساس دلھن، نند بھاوج کی آویزش اور سارا تضاد اور وہ ساری خوبصورتی اور بدصورتی (خوبصورتی کم اور بدصورتی زیادہ) جن سے ایک متوسط طبقے کا گھر بنتا ہے ان افسانوں میں موجود ہیں۔ یہ دنیا چھوٹی نہیں، آپ کے گھر کی دنیا ہے۔ ایک عورت کی دنیا۔ محیط میں سمندر کی سی وسعت ہو نہ ہو، سمندر کی سی پایابی ضرور موجود ہے۔ ان افسانوں کو مصنفہ نے ایک عورت کے سے حسن انتظام اور سلیقے سے سجایا ہے۔ سیدھی سادی زبان جو کم و بیش شمالی ہند کے ہر گھر میں سمجھی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی نسوانی تشبیہیں اور محاورے اور استعارے، شوخیاں اور چٹکیاں جو آپ ہی آپ اس نگار خانے میں خوبصورت گل بوٹے بناتی جاتی ہیں۔ ہر چیز اپنی جگہ پر خوبصورت معلوم ہوتی ہے اور پھر افسانہ کے کلی تاثر میں بھی معتدبہ اضافہ کرتی ہے۔ اس کی زینت کو دوبالا کرتی ہے اس کی آب و تاب کو جلا دیتی ہے اس طرح کہ ہر افسانہ ایک ترشے ترشائے ہیرے کی طرح درخشندہ نظر آتا ہے۔

پہلے پہل جب عصمت کے افسانے اردو رسائل میں شائع ہوئے تو یار لوگوں نے کہا۔

"اجی کوئی مرد لکھ رہا ہے ان افسانوں کو۔ ہماری شریف بہو بیٹیاں کیا جانیں افسانے کیسے لکھے جاتے ہیں!"

لیکن جب عصمت برابر افسانے لکھتی رہیں اور افسانے لکھنے پر مُصر رہیں تو ارشاد ہوا۔

"اجی ہٹاؤ بھی۔ وہ کیا لکھیں گی سڑن کہیں کی۔ بس جب دیکھو جلی کٹی سناتی ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ ایسی بھی کیا عریانی!" .......

پھر وہ دور آیا "ہاں اچھی ہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں شمار کی جا سکتی ہیں (یہ اب اردو میں صفِ اوّل کی نئی بدعت پیدا ہوئی ہے۔ افسانہ نگاروں سے لے کر فاسفورس کے تیل تک ہر چیز ان دنوں "صفِ اوّل" میں شمار کی جاتی ہے۔ تولی جاتی نہیں۔ بیچی جاتی ہی) عورتوں کی نفسیات کو خوب سمجھتی ہیں (یہ عورتوں کی نفسیات بھی خوب رہی) وغیرہ وغیرہ۔

اور اب! اب یہ حال ہے کہ عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ آپ ہی آپ خفیف ہوئے جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ بھی اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔

کرشن چندر

لکھنؤ
یکم نومبر ۱۹۴۲ء

# بھول بھلیاں

"لفٹ رائٹ - لفٹ رائٹ - کوئیک مارچ !" اڑاڑا دھم!! فوج کی فوج کرسیوں اور میزوں کی خندق اور کھائیوں میں ڈھ گئی اور غل پڑا۔

"کیسا اندھیر ہے۔ ساری کرسیوں کا چورا کئے دیتے ہیں۔ بیٹی رفیعہ ذرا ماریو توان مارے پیٹوں کو" چچی ننھی کو دودھ پلا رہی تھیں۔

میرا ہنسی کے مارے برا حال ہوگیا۔ بمشکل مجروحین کو کھینچ کھانچ کر نکالا۔ فوج کا کپتان تو بالکل چوہے کی طرح ایک آرام کرسی اور دو اسٹولوں کے بیچ میں پچا پڑا تھا۔

"آں۔۔۔آں صفدر بھیا نے کہا تھا فوج فوج کھیلو" رشید اپنی کاغذ کی ٹوپی سیدھی کرنے لگے اور منو اپنے چھلے ہوئے گھٹنے کو ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے گھور گھور کر بسور رہے تھے۔ اچھن، چچا جان کے کوٹ میں سے باہر نکلنے کے لئے پھڑپھڑا رہے تھے اور ان کا مفلر بری طرح پھانسی لگا رہا تھا۔ مگر کپتان صاحب ویسے ہی ڈٹے کھڑے تھے۔

"یہ ہو کیا رہا تھا؟" میں نے کپتان صاحب کی سیاہی سے بنی ہوئی مونچھوں کو دیکھ کر کہا۔

"صلاح الدین اعظم رچرڈ شیر دل پر چڑھائی کر رہا تھا، منو کو ہنسی آگئی۔ اور وہ لیٹ گیا" پھر کالی کرسی کھسک گئی اور بس" کپتان صاحب نہایت احتیاط سے مونچھیں

پھکتے ہوئے بولے۔
"اچھا۔ اور یہ اچکن"
"یہی تو رجسٹرڈ ہیں، اور کیا، شیردل، یہ مفلر دیکھو ان کا، یہ شیردل کے بال ہیں"
"اور جناب؟" میں نے چارفٹ کے کپتان کو نظروں سے ناپا۔
"ہم صلاح الدین اعظم" اور وہ اکڑتے ہوئے چلے۔
"اور بھئی یہ میرا کورٹ تو اُتارو، سیاہی لگ گئی تو خدا کی قسم ٹھوکوں گی"
"اوہو۔ آپ کا کوٹ۔ بات یہ ہے کہ اس کے بالوں دار کالر کو ... تو لیجئے نا اپنا کوٹ"۔

---

"رفو باجی ذرا یہ سوال بتا دیجئے" صلّو اپنی سلیٹ میری ناک کے پاس اڑا کر بولے۔
"نا بھئی میں اِس وقت سی رہی ہوں ذرا"
"پھر ہم آپ کو سینے بھی نہیں دیتے" صلّو نے میرے پیروں میں گدگدیاں کرنی شروع کیں۔
میں نے پرسمیٹ لئے تو وہ میری کمر میں سر اَڑا کر لیٹ گیا، اور بکنا شروع کیا "پھٹ جائے، اللہ کرے جھیر جھیر ہو جائے یہ کُرتا۔ سوال تو بتاتی نہیں لیکے کفن سئے جا رہی ہیں اپنا"
"چل یہاں سے پاجی ورنہ سوئی اُتار دوں گی" اور وہ وہاں سے ہٹ کر میری البم اُلٹ پلٹ کرنے لگا۔
"یہ کون ہیں چڑیل جیسی .... کالی مائی .... اور یہ .... یہ ...."
"صلّو بھیا رکھدے میری چیزیں" میں نے سوچا جن ہے یہ تو۔
"تو پھر سوال بتائیے" اور وہ پھر میرے پاس گھُس کر بیٹھ گیا۔
"ارے ذرا ہٹ کے گرمی کے مارے ویسے ہی اُبلے جا رہے ہیں ——"
"تو میں کیا کروں" اور وہ مجھ سے اور لپٹا۔
"میری باجی کیسی —— ہاں گڑیا ذرا بتا دو پھر سوال"

مجبوراً میں نے سوال کرنا شروع کیا۔

"اب یہ سوال سمجھا جا رہا ہے یا میرے بندوں کا معائنہ ہو رہا ہے" اور وہ جلدی سے سلیٹ پر جھک گیا۔ میں بتا رہی تھی اور وہ بیوقوفوں کی طرح میرا منہ دیکھ رہا تھا۔

"اُونہہ" میں چڑ گئی "پڑھ رہے ہو یا منہ تکنے آئے ہو، صلّو وق نہ کرو۔ ورنہ چچی جان سے کہہ دوں گی"

"آپ کی تصویر بنا رہا ہوں۔ یہ دیکھئے، آپ کے ہونٹ بولنے میں ایسے ہلتے ہیں جیسے .... جیسے ——— پتہ نہیں کیا۔ بس ہلتے رہتے ہیں" شرارت سے آنکھیں مٹکائیں۔

"بھاگ یہاں سے اُلّو" میں نے سلیٹ دُور پھینک دی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا الگ بیٹھ گیا۔ اور میں اُٹھ کر برآمدے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد دیکھتی ہوں کہ چلے آرہے ہیں اپنا بستر بوریا سنبھالے۔ یا اللہ خیر!

"کیوں تم پھر آگئے یہاں"

"اور کیا۔ وہاں دل جو گھبراتا تھا" اور وہ پھر میرے پاس بیٹھنے لگا۔

"صلّو اگر تم مانوگے نہیں تو ...."

"تو .... تو .... اِی" اُس نے مُنہ چڑایا "ہم تمہارے پاس بیٹھتے ہیں تو اچھا پڑھا جاتا ہے"

"اچھا تو چپکے بیٹھو"

صلاح الدین میرے چچا کا اکلوتا سپوت تھا۔ پھوٹی آنکھ کا ہی تو ایک تارا تھا۔ اِتنی لڑکیاں پیدا ہوئیں کہ چچا چچی بولا گئے اور پھر آپ تشریف لائے۔ جناب کی اُنگلی دُکھے تو بکرے صدقے کئے جانے لگیں، منتیں مانی جائیں، گھر میں کوئی زور سے

نہ بولے، جوتے اُتار کر چلو، برتن نہ کھڑکے۔ لاڈلے کی آنکھ کھل جائے گی۔ گھر میں اسی لئے کوئی کتّا نہ پلتا، مرغیاں نہ رکھی جاتیں کہ ننھے میاں کی کبھی نیند نہ خراب کردیں اور ہم بچارے نہ لاڈ جائیں نہ لاڈ کریں۔ پھر بھی ماں بہنوں کا لاڈ اُسے کچھ کڑوا لگنے لگتا تھا۔ اور وہ سارے وقت مجھی سے اُلجھتا۔ لوگوں کے "نان وائلنس" سے وہ تنگ آگیا تھا یہی بات تھی کہ وہ جان جان کر مجھے چھیڑتا۔ کیونکہ میں اُسے بُری طرح ڈانٹ دیتی اور کبھی کبھی چپت بھی رسید کردیتی۔

لاڈلے پوت دُبلے اور سوکھے تو ہوتے ہی ہیں اور اوپر سے پتلا بانس جیسا قد۔ امّاں تو نظر بھر کے نہ دیکھتیں، اُنہیں ڈر تھا کہ کہیں اونٹ صاحب کو نظر نہ لگ جائے اور یہاں یہ کہ جہاں لمبی لمبی ٹانگیں پھینکتے آئے اور چھیڑے گئے۔ یہ عادت سی ہو گئی تھی کہ کالج سے آئے اور امّاں کو بلائیں دیکر ابّا دادا کو نبض دکھا کر سیدھے میری جان پر نزول کیا مجال جو گھڑی بھر خود نچلا بیٹھے یا بیٹھنے دے۔ بہنوں کو چھیڑنا۔ کسی کے گدگدی کی کسی کے گلے میں جھول گئے۔ کسی کے کندھے میں کاٹ لیا۔ میرے پاس آئے اور میں نے تھپڑ دیا۔

گھنٹوں ماں بہنیں بیٹھ کر ارمان بھرے ذکر کیا کرتیں۔ ہر دلچسپ اور پُر مسرت بات ضلّو میاں کی شادی کے لئے اُٹھا کر رکھدی جاتی۔

"ضلّو کی شادی میں بناؤں گی۔ سب کی گوالیہ کی چندیری کی ساڑھیاں اور بھئی میں تو دہلی جا کر کروں گی سہیل کی شادی کی طرح اپنے دونوں طرف کے مہمان آگئے۔ اور بس۔ اس گھر میں تو......"

"اور امّاں اُسے بلائیں گے لیلا ڈیسائی کو ناچ کے لئے" ایک بہن بولتیں۔ "بھئی ہم تو سہرا وغیرہ سب باندھیں گے۔ زربفت کی اچکن ماموں ابّا جیسی اور......"

بہنوں کے لئے بھائی تھا گویا جگمگاتا ہیرا! میری اندھی آنکھوں میں جیسے اور

چھ سات بھائی تھے یہ بھی ایک لڑنے جھگڑنے - تو تو میں میں کرنے اور یات بے بات رعب جمانے والی ایک ادنیٰ ہستی تھی - میں اُن کے ارمان بھرے دلوں کے بھڑکتے ہوئے جذبات سے کملا جاتی - کاش میرے بھی اتنے بھائیوں کے بجائے ایک ہی ہوتا - ایک دُبلا پتلا آئے دن کا مریض (چیخا) - لڑاکو - کتنا رومنٹک معلوم ہوتا!

"باجی ذرا کرتے میں یہ بٹن ٹانک دو" وہ اپنی پتلی گردن آگے بڑھا کر بولا "چٹ پٹ ٹانکو مجھے میچ میں جانا ہے" میں ناول کے ایسے حصّہ پر پہونچ گئی تھی جہاں ہیرو ہیروئن کے بازوؤں تک پہونچ چکا تھا - بھلا اسقدر پُرخیز رومانی کام میں میرا کیا جی لگتا -

"رابعہ سے کہو وہ ٹانک دیگی"

"نہیں ہم تو تم سے ہی ٹنکوائیں گے"

"میرے پاس سوئی بھی نہیں" وہ دوڑ کر چچی جان کی بقچی اُٹھا لایا "لو یہ سوئی"

"تاگہ پرو"

"لاؤ میں پرو دوں" چچی سرو تہ چھوڑ کر بولیں -

"میں تو انہیں سے ٹنکواؤں گا - لو سوئی"

مجھے ضد آگئی "راشدہ سے ٹنکواؤ" ہیرو آگے بڑھ رہا تھا - مجھے آخری دو لائنیں پھر سے پڑھنا پڑیں -

"نہیں ہم تو تم ہی سے ٹنکوائیں گے - رکھو کتاب اُدھر - ورنہ پھاڑ دوں گا"

"پھاڑی - بھاگ جاؤ نہیں ٹانکتے" میں نے کتاب دوسری طرح موڑ لی - اُسے بھی ضد آگئی -

"آج یا تو تم سے بٹن ٹنکواؤں گا یا اپنا تمہارا خون بہا دوں گا"

"چل ہٹ بڑا وہ ہے نا - بہاؤ نہ بہاؤ اپنا خون"

ہیرے کی کنی کے خون بہانے کے ارادے ہی کو دیکھکر بہنیں لرز گئیں - اُن کا بس

چلتا تو وہ بٹن کی جگہ اپنی آنکھیں نکال کر ٹانک دیتیں۔

"صلّو لاؤ میں ٹانک دوں ذرا سی دیر میں" راشدہ بولی۔

"کہہ دیا صلاح الدین اعظم ایک بات جو کہہ دیتے ہیں وہ ٹلتی نہیں۔ دیکھو باجی ٹانکتی ہو یا......"

"یا کیا؟" میں نے تیوریاں چڑھائیں۔

"یہی کہ میچ دیکھنے نہیں جاؤں گا اور ایک لفظ کتاب کا نہیں پڑھنے دوں گا اور موقع ملنے پر کتاب پار کر دوں گا—— اور... اور..." مجھے ہنسی آگئی۔

"اوہو۔ لو بس تو پھر پیاری سی بچو کی طرح ٹانک دو"

میں نے بھی سوچا وبال کاٹوں۔ میں نے تو بٹن ٹانکنا شروع کیا اور وہ مجھے دق کرنے لگا۔

"دیکھو صلّو میرا ہاتھ ہل جائے گا تو سوئی کلیجہ میں اُتر جائیگی۔"

"اُتر جانے دو" اور اس نے پھر گدگدی کی۔ میں نے سوئی مذاق میں چبھونا چاہی۔ وہ جلدی سے ہٹا۔ دھکّے سے نہ جانے کیسے سُوئی کی نوک چُبھ گئی، خون بھی نکلا اور غضب یہ کہ نوک غائب سنتے ہیں کہ سوئی کی نوک خون میں کھو جاتی ہے دل میں جا پہونچتی ہے۔ دم نکل جاتا ہے۔

"ارے نوک" میرے منہ سے پریشانی میں نکلا۔

"میرے سینے میں اُتر گئی۔ اور اب خون میں چلی جائیگی۔ اور پھر... پھر دل میں آجائے گی.... لو اماں جان ہم تو چلے" چچی جان کو سکتہ ہو گیا۔ مگر وہ سنبھلیں اور چیخیں۔ رابعہ چیخی اور راشدہ چیخی۔ میرا یہ حال کہ مجرم کی طرح سوئی پکڑے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ صلاح الدین سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور لاچاری سے گریبان مٹھی لینے لگا۔ پھر جو ہلڑ مچا ہے تو خدا ہی جانتا ہے کہ مجھ پر کیا کچھ گذری۔ ڈاکٹر، حکیم اور

نمازیں - اور میرا دل چاہے ڈوب مروں - آخر میں نے مذاق کیا ہی کیوں اور وہ بھی اِس کالج کے گلاس سے -

کیا بتاؤں کیسی پشیمانی ہو رہی تھی - ایکس رے ہوا - سارے جسم میں سوئی ڈھونڈ ڈالی مگر خاک پتہ نہ چلا - اور بھی مصیبت ؟

چچی جان کے آنسو - اور رابعہ ، راشدہ کا ٹہل ٹہل کر دعائیں مانگنا اور اوپر سے صلّو کا اترا اترا کر مرنے کی دھمکیاں دینا - میرے آنسو نکل آئے - صلّو نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا -

"اب تو چین آگیا آپ کو ؟"

میں نے سر جھکا لیا -

" اچھا یہاں آیئے - ذرا میرے سر میں تیل تھپک دیجئے "

بھلا اب مجھ میں ہمت کہاں تھی جو انکار کروں چپ چاپ سر میں تیل ڈالنا شروع کیا - صلّو فخمندانہ انداز سے مجھے آنکھیں چڑھا چڑھا کر دیکھتا اور مسکراتا رہا -

"دیکھا میرا حکم نہ ماننے کا نتیجہ ؟ " وہ میری انگلی میں چٹکی نوچ کر بولا " سوئی تو میرے گریبان ہی میں رہ گئی تھی "

غصہ کے مارے میرا خون کھول گیا -

" اچھا جانے دو - اماں جان کاہے کو مانیں گی - میں نے سوئی پھینک بھی دی "

میرے ہاتھ پھر ڈھیلے پڑ گئے - اور وہ اور ہنسا -

" اچھا باجی تجھے بھی اس کی سزا نہ ملی تو ..... خیر " میرا جی چاہا اس کے بال نوچ کر دور ڈھکیل دوں " خدا سمجھے ...... "

" مجھے تم سے کام کروانے میں مزہ آتا ہے - جب میں نوکر ہو جاؤں گا تو تمہیں اپنے پاس رکھوں گا "

"ہوش میں! میری جوتی رہتی ہے تیرے پاس۔"
"دیکھ لینا۔ میں تمہیں لے لوں گا — گود لیلوں گا — ہنستی کیوں ہو۔"
مجھے ہنسی آگئی۔
"اور پھر تمہیں ہوائی جہاز میں بٹھاؤں گا۔ ہاآں ..... !" وہ آنکھیں گھما کر بولا۔

---

میرے امتحان کے دن آگئے تھے۔ اور میں کمرہ بند کرکے پڑھا کرتی۔ مگر صفدر کہیں مانتا تھا۔ جہاں میں پڑھنے چلی اور وہ بھی موجود۔ میں نے سنجیدگی سے منع کر دیا کہ "اگر تم نے دق کیا تو میں بورڈنگ چلی جاؤں گی۔" پڑھنے کے خیال سے چچا میاں کے گھر رہنا پڑا تھا۔
وہ خاموش پڑھا کرتا۔ مگر گھنٹہ آدھ گھنٹے بعد بےچینی ہونے لگتی۔
"اب بھائی انٹرول ہوگا۔" وہ کتاب بند کرکے میرے پاس آن گھستا۔ اور دس منٹ تک وہ اودھم مچاتا کہ خدا کی پناہ۔ شرارت میں اُسے کاٹنے کا مرض ہوگیا تھا۔
"بات یہ ہے کہ جی چاہتا ہے کہ تمہیں کھا جاؤں۔" وہ ہنس کر دانت پیستا۔
"خود اپنی بوٹیاں چبا ڈالو۔" مگر وہ بُری طرح لپٹ جاتا، اور باوجود ڈھکیلنے کے تنگ کئے جاتا۔ کبھی مجھے غصّہ آجاتا۔ لیکن عموماً اگر وہ کمرہ میں نہ ہوتا تو کسی چیز کی کمی سی محسوس ہوتی۔ گھر کی ساری چہل پہل اُسی ایک انسان کے دم سے تھی۔ بچوں کو چھیڑنا، بہنوں کو رُلانا، کبھی پھر فوراً لپٹ کر پیار کرنا اور منا لینا۔

---

امتحان ختم ہوگئے۔ اور گھر جانے کے خیال سے خوشی کے ساتھ ساتھ دکھ بھی ہوتا تھا۔
"کیوں جا رہی ہو چھٹیوں میں؟" وہ ایک دن بولا۔
"واہ میری اماں بیچاری اکیلی ہیں۔"
"اکیلی! جیسے اُنہیں بڑی تمہاری پروا ہے۔"

"ہوں اور نہیں تو تمہیں پروا ہو گی"
وہ میرے پاس بیٹھ گیا "سچ کہتا ہوں بجو.... سچ کہتا ہوں۔ تم نہ جاؤ" اس نے پیار سے میرے کندھے پر سر رکھدیا اور اپنی سوکھی باہیں میرے گلے میں حائل کر دیں۔
"ہٹو تو...... خیر ہو گی تمہیں میری پروا۔ مگر اب تو جاؤنگی"
"مگر میں کہتا ہوں کہ مت جاؤ" وہ ذرا ہٹ کر بولا۔
"بکواس مت کرو۔ جاؤ ذرا کسی کو بھیجو میرا سامان باندھ دے"
"اور میں کہتا ہوں تم نہیں جا سکتیں"
"ہتھ! بڑے لاٹ صاحب ہونا جو روک لوگے"
"یاد ہے وہ سوئی" وہ شرارت سے مسکرایا۔
"مکار ہو تم.... کہیں کے"

---

دوسرے دن صلّو کو بخار چڑھا۔ سارے گھر پر جیسے آفت ٹوٹ پڑی۔ ذرا سا ملیریا اور یہ اودھم! مگر دم مارنے کی اجازت نہ تھی۔
"امّاں جان بجو کو روک لیجئے آپ سے اکیلے تیمارداری نہ ہو سکے گی" جیسے سور کو بڑی تیمارداری کی ضرورت تھی!۔
"اے میاں بھلا وہ کیوں رُکیں گی!" چچی اماں طعن سے بولیں "میں حمیدہ کو تار دیکر بلا لوں گی"
"نہیں اماں وہ اپنے بچے لیکر آن دھمکیں گی تو اور غل مچے گا۔ بجو تو خود رُک رہی تھیں۔ اسکول میں پارٹی ہے۔ دوسرے جب ہم اچھے ہو جائیں گے تو سینما دیکھنے چلیں گے"
"رُک جاؤنا کیسا ہرج ہے" رابعہ نے رائے دی۔ اُسے چڑیل کو کیسا پتہ کہ یہ مکاری کر رہا ہے۔ بخار تو اتفاق سے آ گیا۔ ورنہ وہ کچھ اور فیل مچاتا۔ رُکنا ہی پڑا۔

"صلاح الدین اعظم کا حکم!" وہ شرارت سے مسکرایا۔ "میرے مونچھیں نکل آئیں تب تمہارے اوپر اصلی رعب پڑا کرے گا۔ لو اسی بات پر ذرا سی برف گھول کر تو کھلا دو۔" چچی جان نے اس قدر رو ٹھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا کہ میں جلدی سے تولیہ میں برف توڑنے لگی۔ کسی کا لاڈلا ہو تو ہو ہم کیوں جھگتیں۔ مگر وہ تو بھگتنا پڑا۔

"بجو... بجو..." کسی نے آہستہ سے مجھے پکارا۔

"کیا ہے؟" میں ڈر گئی۔

"ذرا سا پانی" صفو نے اپنے پلنگ سے ہاتھ ہلا کر کہا۔ میں جلدی سے اٹھی۔ اندھیرے میں تھرماس ٹٹول کر پانی نکالا۔

"اماں تھکی ہوئی ہیں.... بیٹھ جاؤ" اس نے سرہانے مجھے بٹھالیا اور آہستہ آہستہ گلاس میں برف ہلانے لگا۔

اُسے میری طرح پسینہ آ رہا تھا اور ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ پانی پی کر وہ میری گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"بجو!"

"کیا ہے؟"

"میرا دل گھبرا رہا ہے"

"چچی جان کو جگاؤں" میں نے چاہا آرام سے اس کا سر تکیہ پر رکھ دوں۔

"نہیں.... بلوست!" اس نے اپنے پتلے پتلے ہاتھ میری کمر میں ڈال دئے۔

"دل گھبرا رہا ہے بجو!" وہ تیزی سے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اپنے کو چھڑانے کی کوشش نہ کی اور اس کی پیشانی پونچھنے لگی۔ وہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ اس نے جلدی جلدی میرا نام لیکر بڑبڑانا شروع کیا۔ سسکیاں اور وہ سسکیاں بھرنے لگا عجیب سوکھی سوکھی اُکھڑی ہوئی سانسیں۔ میں سمجھی نہ جانے کمبخت کو سرسام ہو گیا۔ یا کیا،

اور اسے لٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

"بجھ جاؤ مت .... میں مرجاؤں گا" اور بُری طرح بچوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ اور اس کی آنکھیں! اوہ جیسے .... نہ جانے آج مجھے ان آنکھوں میں کیا نظر آرہا تھا۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ شوخی سے تھرکنے کے بجائے چڑھی ہوئی اور گہری تھیں۔ کچھ پاگل سی! کچھ عجیب! مجھے تھوڑی دیر کے لئے یہ معلوم ہوا گویا اندھیرے پیچ دار راستوں میں پریشان چکر لگا رہی ہوں۔ اور کوئی دروازہ نہیں ــــــ

کوئی قریب کے پلنگ پر کلبلایا۔ اور وہ جلدی سے چونک پڑا "جاؤ.... رابعہ جاگ گئی!" اُس نے خوف زدہ ہو کر مجھے دور دھکیل دیا۔ "جاؤ جلدی!" وہ خود ڈر کر چادر میں چھپ گیا۔

میں پریشان لیٹ گئی۔ یا اللہ! کیا واقعی یہ پاگل ہو رہا ہے! "رابعہ جاگ گئی!" تو کیا ہوا؟ مجھے چچی جان پر رحم آنے لگا۔ خدانخواستہ.... خیر....

اور اس کے بعد سے اُس میں ایک غیر معمولی انقلاب ہو گیا۔ وہی رات والی پاگل گہری اور چڑھی ہوئی آنکھیں کبھی بغیر بخار اور ہذیان کے بھی کچھ عجیب ہو جاتیں۔ وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ چھیڑنے اور چڑھانے لگا۔ مجھ سے ہر وقت الجھتا اور پھر بالکل پاگل ہو جاتا۔ وہ میرے قریب میں رہنے کے بہانے تراشتا۔ ہر جگہ، ہر کمرے، ہر موڑ، اور ہر کونے پر وہ میری تاک میں مجھے ڈرانے اور رگڑ گدانے کے لئے چھپا رہتا۔ میں اس کی ضرورت سے زیادہ توجہ سے کبھی بے طرح پریشان ہو جاتی، اور کبھی مجھے وہ سب ایک الھڑ لڑکے کی شرارتیں معلوم ہوتیں۔ اور یہ شرارتیں کس تیزی سے بڑھ رہی تھیں!۔

---

دو سال بعد جب میں رابعہ کی شادی پر آئی تو صلو کو صلاح الدین اعظم کہنا پڑا۔

اُفّوہ ایک چھوٹا سا لچکتا ہوا کملایا سا پودا نوخیز درخت بن گیا تھا۔ خون کی حدت سے چہرہ سانولا گیا تھا۔ اور پتلے سوکھے زرد ہاتھ سخت گٹھلیوں دار مضبوط شاخوں کی طرح تھلے ہوئے بالوں سے ڈھک گئے تھے۔ اور آنکھیں تو بخدا بالکل ہی پاگل ہو گئی تھیں۔ پتلیاں ناچتی بھی تھیں اور ایک دم سے جم کر گہری ہو جاتیں کہ فوراً آنکھ جھپک جائے۔

"بجّو کچھ میری مونچھوں کا رعب پڑتا ہے؟"

"خاک! اسقدر ترّی شکل ہو گئی ہے"

"اور تمہاری بڑی بھولی ہے نا" اس نے مجھے گدگدانا چاہا۔ میں اس کے بڑے بڑے ہاتھ دیکھ کر ہی لرز گئی۔

"ہٹو صلّو.... خدا کے لئے۔ تم سے ڈر لگتا ہے۔ ریچھ ہو گئے ہو بالکل"

"ہاں" اور وہ غرور سے اور پھیل گیا۔

"ارے میں اردوں کی صلّو...." اس نے زبردستی اپنا کھردرا گال میرے ہاتھ پر زور سے رگڑ دیا۔ سارا ہاتھ جھلا اٹھا۔ جیسے لوہے کا برش۔ کبھی تو میں آنکھ چرا کر چھپاتی تھی۔ نہ جانے کیوں؟۔

---

شادی کا گھر اور وہ بھی ہندوستانی طور طریق۔ گھر کیا ہوتا ہے ایک بھول بھلیاں کا راستہ جس میں مزے سے آنکھ مچولی کھیلو۔ سر کو پیر کی خبر نہیں رہتی۔ اور نہ جانے کتنے کھلاڑی آنکھ مچولیاں کھیل رہے ہوتے ہیں۔ کبھی دو چوروں کی کسی کونے میں ٹکر ہو جاتی ہے تو پھر جھینپ کا مزہ آجاتا ہے۔

معلوم ہوتا تھا کہ گھر کے ہر کونے، ہر دیوار کی آڑ میں، ہر زینہ پر کئی کئی صلاح الدین کھڑے ہیں۔ آپ کدھر بھی نکل جائیے ناممکن جو صلاح الدین نہ موجود ہو جائے۔ بعض وقت تو یہ معلوم ہوتا گویا آسمان ہی سے ٹپک پڑے۔ میں عاجز آکر

رابعہ کے پاس گھس گئی۔ لو وہ تھوڑی دیر میں لاڈلا بھیا بہن کی صورت دیکھنے کو موجود!
اور پھر یہ کہ ہم دونوں رضائی میں مشکل سما رہے ہیں کہ جناب مع اپنے بے ڈول ہاتھوں
اور چوڑے کندھوں کے اُسی رضائی میں گھسیں گے۔ کس سے شکایت کی جائے۔
کس کے آگے گِلا کریں؟ یعنی اُن جگر کے ٹکڑے، کلیجے کی کور، کی کس سے شکایت کی جائے؟
اور کیا شکایت ہو؟ جھڑک دو۔ سنجیدگی سے ڈانٹ دو۔ آپ ہی شرم آئیگی۔ مگر وہ
سنجیدہ ہونے کا موقع بھی دے۔

"جاؤ صلّو سر میں درد ہے" جو یہ بہانہ کیا تو۔

"سر میں درد؟ ارے اماں جان بام کہاں ہے۔ ڈرائیور کو بھیجئے۔ ڈاکٹر سے اسپرو لائے
اور بھئی کوئی شور کرے گا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ چلو رشو، حمید، متّی، اکھسکو یہاں سے
بجّو کے سر میں درد ہے" دروازہ بند! یا اللہ! لیجئے سر کا درد غائب اور اماں جان سے
ضروری کام نکل آیا۔

"کیوں بجّو جھوٹی! کہہ رہی تھی سر میں درد ہے اور یہ یہاں پوریاں تلی جارہی ہیں"
لیجئے باورچی خانے میں بھی موجود۔ اب بھاگئے!۔

کبھی آنچ بگاڑ دی کبھی کچھ اور، پھر وہی شرارتیں! باورچی جانتا ہے کہ میاں
بے تپین بولی ہیں۔

"بی بی آپ بھی جایئے اور صلّو میاں بھی۔ ورنہ مجھ سے کھانا پک چکا!"

"صلّو مجھے تم سے ایک بڑی ضروری بات کہنی ہے" میں نے سوچا آج اُنہیں
سنجیدگی سے ڈانٹوں۔

"کس سے؟ مجھ سے؟ ..... ارے میرے بھاگ!" ایسے خوش گویا تمغہ ملنے والا ہے
اب ضروری بات کہنے سے پہلے خود اسقدر ضروری خدمات انجام دینا شروع کیں
کہ بھاگتے ہی بن پڑے۔

کیا لوگ اندھے ہوتے ہیں؟ دکھائی نہیں دیتا انھیں؟ آنکھ مچولی میں تو بڑے بڑے شاہ پکڑے جاتے ہیں اور بھاگو جیسا چور دن دہاڑے ڈاکہ ڈالنے سے نہ چوکے۔ لوگ سب سمجھتے ہیں بچہ ہے۔

سینما میں لوگوں کو بس عورت ہی عورت دکھائی دیتی ہے خواہ ہزاروں مرد کام کر رہے ہوں اور میں بھی عورت تھی۔ مجھے جلد معلوم ہو گیا کہ چند ایسے غیر جانب دار بھی ہیں جو فیصلہ کرتے وقت نہ کسی کے کلیجہ کا ٹکڑا دیکھیں نہ جگر کی ٹھنڈک، کھری دھار پڑتی ہے تلوار کی۔ مجھی کو تو الزام دیگی دنیا! یہ تو کوئی دیکھتا نہیں کہ فتنہ ..... غصے سے آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔

"ہٹ جاؤ صلاح الدین۔ حد ہوتی ہے بیہودگی کی۔ مجھے یہ باتیں پسند نہیں۔"

"ایں" اُس کا منہ اُتر گیا۔ "کیا ہوا بجو؟"

"کچھ نہیں ..... تمہیں معلوم ہے لوگ کیا کہتے ہیں۔"

"میرا بولنا ... میرا ... آپ کو بُرا لگتا ہے۔"

"ہاں۔ مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔ اچھی بات نہیں۔ لوگ ..."

"لوگ؟ .... کون لوگ؟ - کون لوگ ہیں وہ مجھے بھی بتاؤ ذرا ——"

"کوئی بھی ہوں وہ۔ میری اور تمہاری بہتری چاہنے والے۔"

"بہتری" وہ سُرخ ہو گیا۔

"ہاں اسی میں بہتری ہے۔" اور میں تیزی سے چلی آئی۔ دل پر سے ایک بوجھ اُتر گیا آخر کو میں نے کہہ ہی دیا۔ عورت کے تو ہاتھ میں ہے خواہ وہ بدراہ ہو جائے خواہ عین موقع پر آنکھیں کھل جائیں اور اُسے عاقبت نظر آنے لگے۔ آنکھیں کھل گئیں اور خوب موقع پر کھلیں! میں دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔

صلاح الدین آیا۔ میں حسب عادت چونکتی ہو گئی۔ مگر گذرا چلا گیا۔ اُس نے مجھے دیکھا تک نہیں!۔ میرے دل پر گھونسہ سا لگا۔ خیر... اُونہہ.... کیا ہے۔ بہتری اسی میں ہے۔ بلا سے جان چھوٹی۔ کسی وقت سکون ہی نہ تھا۔ اب تو... خیر! اور گھر کے ہر کونے اور ہر موڑ پر اب کوئی بھی تھا؟۔ گویا امن، چین اور سکون! لیکن یہ پھر پریشانی کیسی؟ ایک فکر سی، ایک پستی، گویا کمان اُتر گئی، دھار کھٹل ہو گئی۔ گویا کچھ ہے ہی نہیں۔ اب کوئی آپ کو دیکھکر کھنچا نہیں چلا آتا۔ اب کسی کو شرارتیں نہیں سوجھتیں، اب کسی کی عجیب اور پاگل آنکھیں آپ کے پیچھے نہیں دوڑتیں۔ جائیے شوق سے جائیے۔ اندھیری کوٹھری میں بھی چلے جائیے۔ کوئی مزاحمت نہیں کرتا۔ جو ملتا بھی ہے تو آپ کو جھک کر آداب عرض کرتا ہے اور سر جھکا کر چل دیتا ہے ایک طرف کو۔ اب کوئی آپ کے پاس گھس کر بیٹھنے کا شوقین نہیں۔ بلکہ دور.... وہ سامنے کمسن خوبصورت لڑکیوں کے جھرمٹ میں شرارت بھری آنکھیں نچا کر خراج تحسین وصول کر رہا ہے۔ کبھی بھولے سے بھی اگر آنکھ مل جاتی ہے تو سر جھک جاتا ہے۔ نہچانتا تک نہیں!۔

شادی کے گھر میں معلوم ہوتا ہے موت ہو گئی۔ ایک موت نہیں سینکڑوں موتیں۔ ہزاروں خیالات، سینکڑوں جذبات، اور اَن گنت مسکراہٹیں مردہ پڑی ہیں۔ گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔

اور چچی تو معلوم ہوتا ہے کبھی تھیں ہی نہیں کوئی اپنی۔ رابعہ اپنے دولھا کے خیال میں مست۔ حمیدہ کا بچہ ضروریاتِ زندگی ہی سے فارغ نہیں ہو چکتا۔ جی چاہا بچ شادی سے پہلے دوں کالج۔

دیکھنے والوں نے دیکھ لیا اور تاڑ بھی لیا۔

"اے یہ تسلو کی اور تمہاری کیا اَن بَن ہو گئی ہے" چچی بولیں۔

"نہیں تو" میں جلدی سے بولی۔

بھوت " صلّو نے دبی آواز میں کہا اور کھانے کی پلیٹ پر جھک گیا۔

" اوئی! چھوٹوں سے کیا غصّہ۔ چلو صلّو باجی سے معافی مانگو"

" جی نہیں..... یہ خود مانگیں معافی " صلّو اکڑ ے۔

" معافی وافی کیسی؟ کوئی لڑائی نہیں ہوئی " میں نے معاملہ کو سیدھا کرنا چاہا۔

" جی نہیں میری تو ہے لڑائی "

" یہ کیوں۔ آخر ہوا کیا؟ "

" ہوا یہ کہ..... خواہ مخواہ ڈانٹنے لگیں.... " میں ڈری۔

" کچھ بھی نہیں چچی جان یہ مجھے چھیڑ رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا مجھ سے مت بولو۔ بھلا میں اِس سے لڑوں گی " میں جلدی سے بولی۔

" نہیں اماں جان.... کیسی بھولی بن رہی ہیں۔ ایسے انہوں نے نہیں کہا تھا..... " اور میں ڈری کہ کہیں اِس نے کہہ دیا سب کے سامنے تو کیا ہوگا۔ مجھے خیال ہوا کہ میری غلط فہمی ہو گی۔ شاید یہ بھی اِس کی شرارتیں ہیں اور.... اور شاید یہ شرارتیں ہی ہوں، لعنت ہے کہ میں اسے اسقدر ذلیل سمجھی ا۔

" مجھے ایسی بُری طرح کہنے لگیں.... ہمنہ، جیسے میں کوئی وہ ہوں..... "

" ارے میں تو یونہی کہہ رہی تھی " لیجئے ملاپ ہوگیا! اب؟

" لو اسی بات پر ہاتھ ملاؤ۔ اُوہ.... کس قدر سردی ہے۔ ساری رضائی آپ اوڑھے بیٹھی ہو یہ نہیں کہ کسی اور کو بھی اُڑھا لو "

وہ رضائی میں گھُس کر بیٹھ گیا اور میرے اتنی چٹکیاں لیں کہ ملاپ کرنے کا مزہ آگیا۔

" صلّو خدا کا واسطہ۔ پھر کھوگے میں نے یہ کہا اور وہ کہا " چچی جان معصومیت سے مسکرا رہی تھیں۔

" کہا ہی کیسے تم نے۔ بولو ہاریں کہ نہیں "

"بابا میں تجھ سے جیتی اور نہ جیتنے کا شوق۔بس " وہ ہنسا، دنیا کی ہر چیز ہنس پڑی۔
اور پھر وہی آنکھ مچولی! وہی بھُول بھلیاں! اور عاقبت؟ ایک دفعہ کو عاقبت بھی کھلکھلا پڑی۔کونا کونا مسحور کن نغموں سے گونج اٹھا۔کان گنگ ہو گئے۔اور آنکھوں میں ریت بھر گئی۔میٹھی میٹھی کھٹک والی ریت!۔
اور اب قصور کس کا؟ قصور تو ہونا ہی ہوا کسی کا۔تقدیر کا؟۔بچاری تقدیر!
بات یہ ہے کہ اللہ پاک اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے۔یہ دیکھنے کے لیۓ کہ.... وہ تاکہ دیکھے ....یہی کہ بس دیکھے! جیسے کہ ہم تماشہ دیکھتے ہیں! ڈر.... دھڑکا۔بدنامی، ذلت، پریشانی، بربادی، تباہی اور.... اور سب کچھ ایسے ہی موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔کچّی شاخ میں جھولا ڈالو تو آپ ہی چرچرا ئیگی۔بھئی پہلے خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لینا چاہیۓ کہ گدّا کمزور تو نہیں۔رسّی تو کھُنی گھُنائی نہیں۔ورنہ آپ ہی ٹُوٹنی لگے گی۔

---

لڑائی پر جانے سے چند دن پہلے تشریف لائے۔ننّھا برآمدے میں "لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ" کر رہا تھا۔اُسے دیکھ کر ایسے سٹپٹائے کہ بس۔
"لمبی چوڑی ہے مری فوج!" میں نے سوچا "بڑے بڑے دہل جاتے ہیں اسے دیکھ کر"
"تم نے مجھے بتایا بھی نہیں"
"کیا....؟"
"یہ...یہ..." وہ ننّھے کو گھورنے لگے۔
"اوہ یہ...ہاں کوئی ایسی بتانے کی بات ہی کیا تھی۔میں نے اسے یتیم خانہ سے لے لیا تھا۔جی بہلتا ہے اس سے"
"مگر یہ... سچ بتاؤ" کتنی گھبراہٹ اور کتنی التجا تھی۔

"کیا بتاؤں؟ .... ہاں تم اپنی کہو، یہ چچی جان نے لاڈلے بیٹے کو کیسے لڑائی پر بھیجدیا؟" میں نے بات پلٹی۔

"لڑائی پر... وہ ... ہوگا... تم پہلے یہ بتاؤ... کہ ....؟" وہ ننھے کیطرف مڑے۔

"سمجھ ہی میں نہیں آتا تمہاری تو .... کہا تو یتیم خانہ ...."

"ہوں" صغّو کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ کچھ کھوئی ہوئی سی کھسیانی صورت۔

"جی گھبرا رہا ہے؟" میں نے چھیڑا۔

اور اُن کی رنگت بدلی "بچارا بچہ! مر گیا اس کا باپ شاید!" تلخی سے کہہ گیا۔

"خاک تمہارے منہ میں۔ خدا نہ کرے" میں نے ننھے کو کلیجہ سے لگا لیا۔

"ٹھائیں ..." ننھے نے موقع پا کر بندوق چلائی۔

"ہائیں ... پاجی .... ابّا کو مارتا ہے" میں نے بندوق چھین لی۔

اور پھر آنکھوں میں وہی شرارت تڑپی .... پھر .... بلا کی گہری ہوگئیں .... کچھ پاگل!... عجیب سی! ..... ٹٹولنے کے باوجود اُس بھول بھلیّاں میں راستہ نہ ملا۔

"پنکچر!"

اوہ بس دم ہی تو نکل گیا۔ کمبخت دو آنے گھنٹہ لیتے ہیں اور ایسی کھُٹی گھُنائی سائیکل پکڑا دیتے ہیں۔ کتنی دفعہ ابّا میاں کو لکھا کہ بھئی ایک سائیکل دلا دیجئے، چھٹی ہو۔ کالج کا کام ویسے نہیں چلتا۔ کون میل بھر گھسٹ کر روز روز جائے اور پھر اس دھوپ میں؟ تو بھیجئے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ سب بناوٹ ہے، کوئی ضرورت سائیکل کی نہیں، لڑکیوں کو تو اترانے کے سوا کچھ آتا ہی نہیں۔ سائیکل ویسے بھی کوئی سواری نہیں، نٹوں کا کھیل ہے۔ پالکیاں، نالکیاں، ڈولیاں سب اُڑ گئیں۔ پہلے تو اچھے اچھے ڈاڑھی والے تک پالکیوں میں سوار ہوا کرتے تھے۔

اور اب؟ یہ "اب" ملعون نہ جانے کیوں پیدا ہو گیا۔ خدا میں سب کچھ طاقت ہے، وہ چاہتا تو یہ "اب" دنیا میں آتا ہی نہیں۔ وہی سہانا "جب" رہتا اور پھر خدا کیا اِس "اب" کے ساتھ عورت کیوں پیدا کر لی تھی۔ کیا بنا عورت کے دنیا نہ چلتی؟ ہاں ذرا بچوں کا سوال ٹیڑھا سا تھا۔ سو وہ بھی کیا تھا، مردوں ہی کی پسلیوں سے کھٹا کھٹ بچے پیدا ہوتے اور کچھ کھا پی کر پل ہی جایا کرتے۔ کیسا سکون ہوتا۔ شانتی ہی شانتی! اگلا تو پنکچر ہو چکا تھا۔

"لعنت ہے" میں نے ٹائر کو لاچاری سے ٹٹول کر سوچا۔ اور ایڈنا کے انتظار میں ریت پر آکڑوں بیٹھ کر سوکھے تنکوں سے زمین پر پھول کاڑھنے لگی۔ یہ ایڈنا ہی کی رائے تھی کہ آج دور کی سیر رہے۔ بھلا شہر سے چار میل مرنے کی مجھے کیا ضرورت آن پڑی تھی۔ سوچا لاؤ ذرا پہیے کو دیکھوں۔ مگر خاک جو عقل نے کام کیا ہو۔ کالجوں اور اسکولوں میں سینا پرونا اور کھانا پکانا تو سکھایا جاتا ہے۔ مگر یہ نہیں کہ ذرا پنکچر جوڑنا بھی سکھا دیا جائے۔ کہو بھلا پڑھ لکھ ہم کھانے پکانے ہی کو تو بیٹھے رہیں گے! چٹورپن عورت کی خصلت میں ہے ہی نہیں اور خدا کسی کو ایسا میاں نہ دے جو ہر وقت زبان کی چاٹ میں مبتلا رہے۔ جو بھوسی چوئی سامنے رکھدی صبر شکر سے کھالی۔ اور پھر یہ سائیکلیں کون جوڑے گا؟ لیجئے جو ذرا پہیہ کھولنے کی کوشش کی تو انگلی الگ پچی اور سارے ہاتھ منڑ گئے بد بو سے۔

ٹنن۔ ٹنن۔ سائیکل کی گھنٹی بجی۔ میں سمجھ گئی، ایڈنا آگئی۔ اور اب مجھے جلائیگی مگر میں نے بھی ارادہ کر لیا کہ لڑ ہی تو پڑوں گی۔

"ہوں۔ پنکچر؟" کوئی بولا —— واضح رہے کہ بولا۔ بولی نہیں —— کوئی راہگیر تھا۔ گو میں قطعی رومانس (ROMANCE) کے موڈ (MOOD) میں نہ تھی۔ لیکن چونک پڑی

"یہ —— جی ہاں —— پنکچر ہو گیا شاید" میں نے معصومیت سے کہا۔

"واقعی!" وہ بے ہنگم سا لمبا انسان مذاق اڑانے کے لہجہ میں بولا۔

"جی ہاں! کوئی کانٹا چبھ گیا شاید" میں نے معصومیت کی دال نہ گلتے دیکھکر اونچی اور کھُرّی آواز سے کہا۔

"واقعی" پھر وہی کمینہ تمسخرانہ گفتگو۔ کاش کوئی اُسے خواتین سے گفتگو کرنے کا سلیقہ سکھاتا۔

"ہیں؟ —— یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں۔ گویا پنکچر نہیں اور کیں ..."

"جی ہاں ـــــ پہیہ بڑی آسانی سے کھول کر ہوا نکالی جا سکتی ہے ــــــ"

"مگر یہ کیوں ؟"

"یہ ـــ یہ ـــ ذرا یونہی ـــ ذرا ـــ" لمبے آدمی کا لمبوترا چہرہ مکّارانہ طریقہ پر مسکرایا۔ واضح رہے صورت سے کوئی شبہ نہ ہوتا تھا۔ خاصہ شریف انسان معلوم ہوتا تھا۔

"اس سے آپ کا مطلب ؟"

"یہی کہ شوق ـــ آپ لوگوں کو ذرا شوق ہوتا ہے کہ جہاں کوئی رومینٹک جگہ دیکھی ، اور کوئی حادثے بیٹھیں ـــ پنکچر ہو رہے ہیں۔ دریا میں ڈوبی جا رہی ہیں۔ بدمعاش لئے جاتے ہیں۔ جہاں دیکھو ــــــ"

"آپ یقیناً بہک رہے ہیں" میں نے جل کر کہا۔ نہ جانے کیوں یہ طعنے میرے دل میں چبھ گئے۔

"جی ـــ بہک ہی تو رہا ہوں۔ یہی تو مصیبت ہے ، ابھی کل ہی تو کتاب میں لکھا دیکھا کہ ایک حسین لڑکی۔ میرا مطلب ہے دوشیزہ کی موٹر راستہ میں بگڑ گئی ، اور ادھر ـــــ ، آپ بتائیے کون آیا ؟" اور وہ کریہہ ہنسی ہنسا۔

میں اور بھی جل گئی "کوئی جانور ـــ شیر ، یا بھیڑیا ـــــ" میں تن کر کہا۔

"آپ بنئے مت ـــ وہی پریوں کا شہزادہ"

"ہوں تو پھر مجھے اس سے کیا ؟" میں نے سوچا۔ اب یہ آیا ہے تو یا تو سیدھی طرح ایک مصیبت زدہ خاتون کی مدد کرے ، جو اس کا اخلاقی فرض تھا ، ورنہ غارت ہو یہاں سے۔

"مگر پھر کیا ہوا ؟ یہ معلوم ہے آپ کو ؟" وہ اور بھی بے تکلفی سے بولا۔ اور بڑے انداز سے سر ایک طرف کو کر لیا۔

"آپ عجیب انسان ہیں ؟" میں نے واقعی تعجب سے کہا۔

"اوہ اب آپ رومینٹک تو بنئے مت !" اس نے ڈھٹائی سے میری سائیکل ٹٹولی۔

"اصل بات یہ ہے، میں سمجھا ——— خیر جانے دیجئے ——— آپ لوگوں کو عموماً یہ عادت ہوتی ہے کہ جہاں رومانس (ROMANCE) کی تلاش ہوتی ——— اور ———"

میں حیرت سے اُس انسان نما جانور کو دیکھنے لگی۔

"اگر آپ ایمان داری سے کہدیں ——— دیکھئے دیکھئے۔ آپ تیور دکھائینگی تو یاد رہے کہ ——— ہاں سنا آپنے۔ میں اس قسم کا آدمی نہیں، سمجھیں صاحب؟ اگر واقعی آپ کی سائیکل بگڑ گئی ہے۔ تو ازراہ نوازش میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں"۔ اُس نے کوٹ اتار کر آستینیں چڑھائیں۔

میں نے ساری عمر ایسا انسان نہیں دیکھا تھا جس نے میرا کام کرنے سے انکار کیا ہو۔ لڑکے خواہ مخواہ بغرض احتیاط ہماری سائیکلوں میں ہوا بھر دیتے۔ اگر یونیورسٹی گیلری میں اندھیرا ہوتا تو ہر لڑکے کی خواہش ہوتی کہ پہلے سے پہلے جا کر روشنی جلانے کی سعادت حاصل کرے۔ اگر ایسا کبھی اتفاق ہوتا کہ کوئی نظر نہ آتا، تو ہم بالکل لاچار گھبرائے ہوئے اندھیرے میں متوجہ کن آوازیں نکالا کرتے اور سوئچ (SWITCH) کی تلاش میں بڑا غل پڑتا۔ یہاں تک کہ کوئی اللہ کا شیر آ کر ہمیں اس مصیبت سے چھڑاتا۔ یہ لڑکے کالج بھر میں شریف گنے جاتے تھے۔

مگر یہ بے ڈول انسان کچھ عجیب کوڑھ مغز تھا۔

"یوں کام نہیں بنے گا" اُس نے اِدھر اُدھر سے سائیکل کو دیکھ کر کہا۔ "اسے سامنے رہٹ پر لے چلئے۔ وہاں پانی میں پنکچر مل جائیگا"۔

اور بے توجہی سے اپنے کوٹ اور سائیکل کو اُٹھا کر رہٹ کی طرف چلا۔ میں نے دل میں سخت بُرا مانتے ہوئے اپنی سائیکل گھسیٹی۔ مگر کنوئیں پر پانی نام کو نہ تھا۔

"پانی تو ہے نہیں"

"پھر؟" میں نے ہراساں ہوکر پوچھا۔

"پھر!" وہ مسکرایا۔ اور میں ڈری کہ کمبخت پھر مجھے شرمندہ کرنے کی فکر میں ہے۔

"ذرا یہ پہیہ گھمائیے، پانی ہی پانی ہے۔ میں نالی بند کرتا ہوں" اور وہ موری سے کھیلنے لگا۔ آسان کام خود کر کے مجھے رہٹ پر جُتا دینا کہاں کی انسانیت تھی؟ اور پھر سگریٹ جلا کر خوب ہوا میں دھواں پھیلانا شروع کر دیا۔

اُس نے پانی میں ٹیوب ڈال کر پنکچر تلاش کرنا شروع کیا۔ میں لاچار غریب صورت بنائے اُس کے پاس بیٹھی رہی۔ اُس کا کوٹ جو زمین پر پڑا تھا، میں نے اُس کی عزت افزائی کے لئے اپنے گھٹنے پر ڈال لیا، کہ شاید اس کا غصہ کم ہو۔ اور اس سے زیادہ ایک انسان کی کیا عزت افزائی ہو سکتی ہے۔ نہ جانے کیا سوچ کر اُس نے مجھے غضبناک آنکھوں سے دیکھا اور غرّایا۔

"ہوں —— لاحول ولا قوۃ! یہ آپنے پھر مجھے اُلّو بنانا شروع کیا" اس نے ٹیوب پھینک دیا "واہ آپ مزے سے بیٹھی ہیں۔ خود کیوں نہیں بناتیں" وہ دور کھڑا ہو گیا۔

میں ڈر کے اُچک پڑی۔ جلدی سے کوٹ دور پھینکا اور بڑبڑاتے ہوئے خود پنکچر ڈھونڈھنا شروع کیا۔ وہ خود دھواں اڑا اڑا کر منڈیر پر بیٹھا دیکھتا رہا۔

جب کوئی نیا اور جنگلی سا انسان آپ کی ہر مناسب بات کو بھی خواہ مخواہ اعتراض سے دیکھے جائے تو نہ جانے کیوں جی سا گھبرانے لگتا ہے۔ اوپر سے بولا "یہ آپ اِترا اِترا کر پنکچر چھوڑ کیوں دیتی ہیں —— ابھی ابھی آپکا ہاتھ وہاں پڑا تھا"

"نہیں تو۔ کہاں"

"اُفوہ! کس قدر بنتی ہیں"

بننا وننا سب رخصت، مجھے پھر غصّہ آیا "آپ کو کیا، جائیں نا یہاں سے ——"

"اوہو! یہ لیجئے —— آپ نہ جانے کیا سمجھی ہونگیں —— لاحول ولا قوۃ ——"

اور وہ چیلا۔

"مگر سنیئے تو" اُس نے مڑکر کہا "سیلیوشن اور پمپ تو آپکے پاس ہوگا ہی۔ بھلا جب آپکے پاس سب کچھ سامان تھا تو وہاں کیوں پُسر کر بیٹھ گئی تھیں۔ آپ لوگوں کو خدمت لینے کا تو بس چسکہ پڑگیا ہے۔"

"آپ بہت بیہودہ انسان ہیں۔ میرے پاس نہ پمپ نہ سیلیوشن" میں نے کھسیا کر چلاّنا شروع کیا۔

"اچھا یہ بات ہے —— ہوں —— تو پھر کہیئے ہُوا کیا منہ سے بھریں گی؟" اُس نے ایک قہقہہ بھیڑیئے کی طرح سر پیچھے پھینک کر لگایا۔

"آپکی بلا سے" میں نے پنکچر منحوس سُسل کر کہا۔

"پھر —— پھر وہی رومینٹک بننا؟" نہ جانے اُس شخص کو رومانس سے کیوں جلن تھی۔

"آپ کس قدر —— وحشی —— ہیں" میں نے ٹیوب دور پھینک کر کہا۔

"اگر آپ کا کوئی کام ہوتا تو مجھے مدد دینے میں کبھی بھی —— اس قدر کبھی —— بھی —— میں اتنی بدتمیزی نہ کرتی ......"

"دیکھو جی۔ ہم نہ تو وحشی اور نہ جنگلی۔ اور ہم کام سو دفعہ کریں۔ مگر جو تم اینٹھ کر ہمارے اوپر دھونس جماؤ تو —— واضح رہے کہ ——"

"مگر آپ بدتمیزی کیوں کرتے ہیں" میں نے گھبرا کر کہا۔

"تم بھی تو بدتمیزی کر رہی ہو۔ دیکھو نا اب جو تمہاری جگہ کوئی لڑکا ہوتا، خدا کی قسم جوتے مارتا اُس کے اور دو سرے پہیہ میں بھی پنکچر کر دیتا۔ انتہا ہے گدھے پن کی کہ نہیں نہ سیلیوشن، نہ پمپ اور جنگل کی سیر کو جا رہی ہیں۔ جانتی ہیں، کوئی مل ہی جائیگا۔ جو پنکچر جوڑ دیگا۔ اور ہوا بھر کر، آپ کو سائیکل پر لاد کر پہونچائیگا گھر۔"

افوہ - میرا دل چاہا زور زور سے چنگھاڑیں مار مار کر رو دوں - یا گنواریوں کی طرح موٹی موٹی گالیاں دیکر اُس کے منہ پر ہی کیچڑ کھینچ ماروں - جو میرے پیروں میں بے طرح لتھڑ گئی تھی - مگر پھر شرافت آڑے آ گئی - اور میں نے زور سے دانت بھینچ لئے - نہ جانے اب بھی اُس کی کونسی کل سیدھی رہ گئی اور اُس نے دور ہی سے سیلیوشن ٹیوب پھینکدیا - بدتمیز انسان نے ہوا بھی نہ بھری بیٹھا دیکھتا رہا - کس قدر دردناک سماں تھا - ہوا میں نے خود بھری! -

"آپ کا نام کیا ہے، آپ یہ سیلیوشن اور پمپ لے جا سکتی ہیں - پتہ دے جائیے اپنا"

"مجھے نہیں چاہیئے آپ کا سیلیوشن" میں نے سائیکل کو کوستے ہوئے اُٹھا لیا -

"اوہو پھر بنیں"

سامنے سے ایڈنا آتی دکھائی دی -

"آپ کی سائیکل میں پنکچر نہیں ہوا؟" اس نے بناوٹی استعجاب سے بغیر کسی تعارف کے ایڈنا سے پوچھا -

"نہیں تو" ایڈنا تیوریاں چڑھا کر بولی - میں خوش ہوئی کہ اب یہ جنگلی اسکی بھی خبر لیگا -

"تعجب" وہ بولا -

"کیوں" ایڈنا اکڑی -

"ان کی سائیکل میں تو ہو گیا" اس نے طنز سے میری طرف دیکھ کہا -

"جھوٹ بالکل تو نئے ٹائر ہیں" ایڈنا بولی -

"جی ہاں ــــ نئے ٹائروں میں تو اور بھی جلدی ہوتا ہے" اور وہ قہقہہ لگاتا چلا گیا

"بسلی" ایڈنا جل کر بولی -

میں نے اُسے اُس جنگل کی ایک بات بھی نہ بتائی۔ اِس قابل ہی کب تھی کوئی بات؟
وہ باتیں ہی اور ہوتی ہیں جنہیں ہم سر جوڑ جوڑ کر ایک دوسرے کو بتایا کرتے ہیں۔

یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لٹھ نما حیوان یونیورسٹی میں ریسرچ کے لئے اسی سال آیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے!

"ہلو پنکچر!" وہ کئی دفعہ ملا اور بے تکلفی سے بولا۔ اور پھر ہم اور زیادہ ملنے لگے۔ بہت جلد ہم بے تکلف ہو گئے۔ وہ اکثر آیا کرتا۔ مجھے پہلی دفعہ یہ معلوم ہوا کہ بے لوث کھرا پن، چاپلوسی سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔ گو وہ عموماً میری بات کاٹ دیا کرتا تھا۔ لیکن ہم پھر بھی ملتے تھے۔ آئیڈنا اُس کی صورت سے جلتی تھی اور کہتی تھی کہ "اس جنگلی کو اتوار کا ستیاناس کرنے کو تو کم از کم مت بلایا کرو۔"

میری اس کی ایک گھڑی نہ بنتی تھی۔ جہاں کسی شاعر یا مصنف کی تعریف میرے منہ سے نکلی اور وہ بولا "اجی ہٹاؤ کمبخت کو، میرا بس چلے تو جلوا دوں اُسے تو۔"

جہاں کہیں میں نے کسی تقریر کی تعریف کی اور اس نے بکنا شروع کیا "لاحول ولا قوۃ۔ کسقدر ذلیل ٹرٹر تھی۔ کچھ تھا بھی اُس میں۔ میں تو چُپ رہا۔ ورنہ —— وہ تو کہو خیر ہوئی۔"

میں اِن باتوں سے اِس قدر جل جاتی کہ اُسے دلائل سے قائل کرنے کی برداشت نہ رہتی۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ میں اُس سے ملتی ہی کیوں ہوں۔ مجھے کسی کی حکومت سہنے کی عادت نہ ہے نہ کبھی ہو۔

ایک دن تو بدتمیزی کی انتہا ہو گئی۔ اور آئیڈنا نے کہا "پارٹی کے دام غارت ہوئے؟ ہم نے پروفیسروں اور چند نامی لڑکوں کو دعوت دی۔ آپ بھی آئے، بولے "تم بھی تو مضمون لکھتی ہو؟"

میں نے کتنی ہی دفعہ کہا بھئی سب کے سامنے "تم" سے نہ بولا کرو۔ مگر اُس نے

ایسی بُری بُری دھمکیاں دیں کہ مجبوراً سہہ گئی۔
"ہاں۔ لکھتی ہوں۔" میں نے ذرا تکلف سے کہا۔
"کیسے لکھ لیتی ہو مضمون؟" اُس نے حیرت سے کہا۔
میں چونکی۔ مگر سنجیدہ دیکھ کر کوئی شاعرانہ طریقہ سوچنے لگی۔
بولے "خیالات دل میں آتے ہوں گے۔"
میں نے سر ہلا دیا۔
"وحی سی آتی ہوگی؟"
"ہاں۔ وحی آتی ہے۔" میں نے انسانیت کے جامہ میں دیکھ کر مُسکرا کر کہا
"کیسے آتی ہے وحی تم جیسوں کو۔ جیسے مرگی کا دورہ پڑتا ہے ویسے ہی؟ پہلے کچھ سُرسُری سی لگتی ہوگی؟" وہ پھر اُڑانے لگا مجھے!۔
"خیالات ہوتے ہیں، وہ دماغ میں آجاتے ہیں۔" ایک اور صاحب بولے۔ اُنہیں شاید مجھ پر رحم آیا۔
"نہیں جی۔ خیالات وغیرہ کچھ نہیں، ہمیں نہ آجائیں خیالات؟ یہ تو کوئی اور بات ہے۔" مکّاری سے مُسکرایا۔
"کوئی اور بات کیا ہوسکتی ہے۔" ایک پروفیسر نے کہا۔
"یہی کوئی —— اب یہ تو ڈاکٹر سے پوچھا جائے۔" وہ ہنسی چھپانے کو آگے جُھک گیا۔

میں اور سارے سننے والے سکتے میں رہ گئے۔ کچھ بدتمیز لوگ ہنس بھی پڑے۔
سب کے جانے کے بعد میں نے لڑنے کی بے انتہا کوشش کی۔ مگر ناکام رہی۔ وہ بضد اس بات پر اَڑا رہا کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ خیر اس میں ہے کہ بجائے فخر کرنے کے فکر کی جائے۔ آثار کچھ اچھے نہیں اور اُلٹی میں نیم پاگل تو ہو ہی چکی ہوں۔

وہ عموماً مجھے "بنکچر" کہا کرتا۔ میں نے بغاوت آمادگی ظاہر کی تو مجھے سب کے سامنے بنکچر کہنے پر تُل گیا۔ کہا نا میں نے، کہ اُس سے تو بحث کرنا بیکار تھا۔ میں بچوں کی طرح چڑھ جاتی اور بات اُس سے کیجائے جو انسانیت کے جامے میں ہو۔ خواہ مخواہ کے اعتراضوں سے نہیں ڈرتی۔ پر نہ جانے کیا بات تھی جب وہ کسی بات پر اعتراض کرتا، میرے دل کو جا لگتی۔ اور بغیر ارادی طور پر وہ بات ہی پھر مجھ سے نہ کی جاتی۔

---

دُہرانے سے کیا فائدہ۔ بس ہم برابر ملتے رہے، آپ تعجب کریں گے کہ کیوں میں نے اس جنگلی سے راہ و رسم جاری رکھی۔ تو یہ خود نہیں معلوم۔ کمزوری سمجھ لیجئے۔ یا جو جی چاہے آپ کا۔ نہ جانے اس میں کیا بات تھی کہ کھینچ لیتی تھی۔ وہی باتیں جو پہلے بدتمیزی معلوم ہوتی تھیں اب بھلی معلوم ہونے لگی تھیں۔ سچ تو یہ کہ ادپری دل سے اُسے وحشی اور جنگلی کہنے کے باوجود اگر وہ کسی دن نہ آتا۔ اور ایک آدھ جھگڑے کا لطف پیدا نہ ہوتا، تو جی نہ لگتا۔ میرا دل خوف سے بیٹھ جاتا جب مجھے محسوس ہوتا کہ اُس کے بغیر زندگی سُونی ہوگی۔ اس کے دل کا حال مجھ سے پوشیدہ تو نہ تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو دو انسانوں کے ملنے سے ہوتا ہے۔ پر وہ انسان ہوتا جب نا! ۔ اُس کی تو کوئی بات ہی ڈھنگ کی نہ تھی۔ اُس کے اظہارِ اُلفت کا طریقہ بالکل حضرت آدم کا سا تھا۔

---

وہ جنگلات میں ایک معمولی عہدے پر مقرر ہوگیا۔ اور اب بجائے روزانہ کے ہفتہ اور اتوار کو ملنا ہوتا۔ اُس نے بارہا وہاں کی تنہائی کا ذکر کیا۔ مگر جونہی میں نے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہا، تنہائی، سکون، اور اطمینان کی زندگی کہکر اُلٹی تعریف کرنی شروع کردی، مجھے اب بھی انتظار تھا۔ نہ جانے کس بات کا۔ ایک دن فرمانے لگے "تم ہوتیں تو یقیناً پسند کرتیں، تیرنے کے لئے بہترین مقام ہے" اور اس سے آگے کچھ بھی نہیں۔

میں خاموش رہی۔ کئی دفعہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس سے قبل کہ میں خود ہی موقع دوں وہ کسی معمولی سی بات پر اس بُری طرح اعتراض کرتا کہ میں جل کر دل میں توبہ کرتی، کہ خدا ہی بچائے اس بلا سے۔ مگر ہم عورتوں کی کوئی بات سیاسیات سے خالی نہیں ہوتی۔ اگر ہم کسی بات کو کرنا چاہیں تو سیدھے راستے کبھی نہیں چلتے۔ بلکہ گھوم گھام کر منزل مقصود پر پہونچتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کامیابیاں زیادہ تر عورتوں ہی کو نصیب ہوتی ہیں۔ گو کوئی مانتا نہیں اس بات کو۔

فرض کیجیے کہ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا چھوٹا سا بھائی ذرا تخت کے نیچے گھس کر اُگالدان نکال لائے۔ پردہ ہے کہ شیشے کی گولیوں یا اور کسی غیر دلچسپ کھیل میں منہمک ہو، آپ گھرکتے ہیں، تو وہ رونے کی دھمکی دیتا ہے۔ ایسے موقع پر آپ کیا کریں گے۔ ہم تو یہ کرتے ہیں کہ فوراً کسی دوسرے بچے کو پکارتے ہیں جو گھر میں موجود ہی نہ ہو۔

"بھائی لکھن، میاں ذرا اُگالدان تو اُٹھا لاؤ —— وہ —— وہ دیکھو تخت کے نیچے سے اُس کا کنارہ چمک رہا ہے۔ شاباش۔ آہا دیکھیں آنکھیں میچیں کون لائے۔ —— کون لائے" اور وہ معصوم رقابت کے جنون میں تیر کی طرح دوڑتا ہے۔ اُگالدان آجاتا ہے۔ ہے نا؟ تو میں نے بھی منظور صاحب کو آلہ کار بنایا۔ بڑی شرم کی بات ہے، پر آپ ہی بتائیے اور کیا کرتی؟

اگر میں اُس سے بےحیائی لاد کر کہہ دیتی "آؤ ہم تم شادی ہی کر لیں نا، بیکار تم وہاں تنہا اور میں یہاں" تو یقیناً وہ بھڑک اُٹھتا۔ مجھے معلوم تھا وہ مر جائے مگر مُنہ سے تو کبھی کچھ نہ کہے گا۔ اِس سلسلہ میں خدا معاف کرے منظور کی نئی موٹر میں بڑی بڑی سیریں کیں۔ اور یہ دستور ہو گیا کہ میرا وحشی دوست تو چھٹی لیکر آئے اور میں ٹال دوں۔

"معاف کرنا، منظور نے آج پکچر جانے کا وعدہ کیا ہے۔ بہت عمدہ پکچر ہے" اور وہ اپنا سا مُنہ لیکر چلا جاتا۔ میرا دل کٹ جاتا اور پکچر دھندلی دکھائی دیتی۔ منظور۔ خدا کرے

اُسے بہت اچھی بیوی ملے ۔ اس غیر معمولی عنایت سے ذرا بھی حیران نہ تھا۔ نئی نوکری نے شادی کے بازار میں ان کی چوگنی قیمت کردی تھی۔

مگر اللہ رے جنگلی پن ۔ رقابت اپنا کام کئے بغیر نہ رہتی اور وہ تلملا اٹھتا ۔ بل کھاتا۔ مگر کیا مجال جوٹس سے مَس ہو جائے ۔ اور ہی علاج کیا ۔ یعنی آنا ہی چھوڑ دیا ۔ اور مجھے بڑی اندھیری شکست کے ہولناک خیالات نے گھیر لیا۔ شکست اور زندگی کے اس خاص شعبے میں؟ یہ سمجھئے زندگی کے ٹائر میں پنکچر۔ شکست کا بدلہ جل کر مکمل شکست کھا لینا ہی ہم لوگوں کے بس کی بات ہوتی ہے ۔ نہ جانے انتقاماً یا خود کو سزا دینے کے لئے ۔ میں نے منظور کی انگوٹھی پہن لی ۔ ذرا ڈھیلی تھی اور گر گر پڑتی تھی ۔ پر میں نے آگے ایک تنگ چھلا پہن کر اسے روکے ہی رکھا۔

---

میں نے اپنے اوپر ایک قسم کی ڈھٹائی سی لادلی تھی ۔ جلدی جلدی تیاریاں کرنا شروع کیں ۔ ارادہ ہوا کہ فوراً ہی کشمیر چلدیں گے ۔ منظور کی غیر موجودگی میں مجھ پر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ۔ دل بغاوت پر تل جاتا اور یہ محسوس ہوتا کہ اگر فوراً شادی نہ ہو گئی تو ضرور پاگل ہو جاؤں گی ۔ مجھے خود پر ذرا بھی بھروسہ نہ رہا تھا ۔ بعض وقت تو ان باغیانہ خیالات پر خود کو سزا دینے کے لئے منظور پر ضرورت سے زیادہ عنایات کی بارش کی جاتی پر کون جانے وہ سارا اظہار اور لگاوٹ دل میں کس کا خیال لیکر کیا جاتا ؟ ۔ خدا ستار عیوب ہے ۔ منظور کو کیا معلوم کہ اُس کی حیثیت ایک ڈمی کی سی تھی ۔ جبکہ دل کہیں اور ہوتا تھا ۔ نہ جانے ہندوستان میں کتنی عورتیں اپنے شوہر کے گلے میں باہیں ڈالتے وقت کس کے خیال میں کھوئی ہوئی ہوتی ہیں ۔ کہتے ہیں سچی محبت بُھلائے نہیں بھولتی ۔ زخم بھر جاتا ہے پر جہاں پوربیہ ہوا چلی اور ٹیسیں اُٹھنا شروع ہوئیں ۔ پر آج کل تعجب ہے مصنوعی ناک کان مل جاتے ہیں تو سکونِ قلب کیوں نہیں مل سکتا ؟ یہ ناممکن ہے ضرور ملتا ہے ۔ تلاش

کرنے والا چاہیے۔

---

شام کے وقت درزی کو رخصت کر کے اندھیرے ہی میں خاموش ایک کرسی پر لیٹی رہی۔ کس قدر اُداسی تھی معلوم ہوتا تھا ہوا میں ہزاروں زہریلی گیسیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کلیجے میں عجب قسم کی سوزش ہو رہی تھی۔ کہ اگر بہت ضبط کیا تو سینے میں کوئی چیز زور سے پھٹ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگی۔ منظور! میرا خیال اُن کی طرف گیا۔ انہیں ہی گیس ماسک کی طرح استعمال کر کے ہمیشہ ان گیسوں سے بچ جایا کرتی تھی۔

برآمدے میں آہٹ ہوئی۔ منظور کے آنے پر مجھے ہمیشہ بن کر چونکنا پڑتا تھا۔ اور اس وقت تو میں نیم مُردہ ہو رہی تھی۔ ایک لمبا چوڑا سایہ کمرے کے دروازے پر نظر آیا۔ وہ کچھ آشناسی بالوں کی تراش خاص جھکاؤ لئے شانے اور باہر کی دُھندلی روشنی میں پتھر کی ترشی ہوئی مُورتی کا سا کرخت چہرہ! دل تڑپ تڑپ کر اُچھلنے لگا۔ اگر مجھے پورا یقین نہ ہوتا کہ یہ ظالم مجھے خون تُھکوا دیگا، تو چیخیں مار کر اُس بے رحم سے چمٹ جاتی۔ تین ہفتوں بعد آج مرنے کی فرصت ملی تھی۔ مگر منظور کی متبرک انگوٹھی گیلری کی دُھندلی روشنی میں جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔

"ارے کسقدر اندھیرا ہے" اندر آ کر کہا۔

"کہیں تار بگڑ گیا ہے" میں نے چاہا وہ بجلی نہ جلائے۔ ورنہ میرے منحوس چہرے پہ جو ٹھیکرے ٹوٹ رہے ہیں، وہ کیسے چُھپینگے؟۔

"کہاں خراب ہے یونہی بھی؟" میز کا لیمپ جلا کر ریڈیو کے سامنے اسٹول پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموشی سے ریڈیو کو مروڑتے رہے۔ کھڑ کھڑ، تڑ تڑ، گھر گھر، میرے آنسو نکل آئے۔

میں نے نئے جائے تقرر کی بابت پوچھا "کس جگہ ہے"

"دوزخ" گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔
"کیوں؟ جنگل تو پرفضا ہوتے ہیں" میں نے کہا۔
"ہوں شاعروں کے لئے"
یا اللہ! کدھر سجدہ کروں؟ ۔ یہ تغیّر۔
"نہیں درندوں کے لئے بھی" میں نے جواب دیا۔ پھر پچتانے لگی۔ کہ میرا تو ارادہ ہی بے تکلّف ہونے کا نہ تھا۔
"ہوں۔ مگر پالتو درندوں کے لئے نہیں! جو پنجرے کے عادی ہو چکے ہوں"
آواز کی نرمی مجھے متحیر کئے بغیر نہ رہ سکی۔
"مگر آپ کو تو تنہائی پسند ہے۔ شکار تو خوب ہوتا ہوگا"
"خاک" ذرا جلی ہوئی آواز میں کہا۔
"کیوں، عبّاس، شہاب، نہ جانے کون کون تھے، اُن کا ذکر آپ مزے لے لے کر کرتے تھے"
"وہ — عبّاس اپنی بیوی کو لے آیا۔ شہاب کی ستمبر میں شادی ہو گئی۔ محمود دوڑ دوڑ کر دہلی جاتا رہتا ہے۔ ضیا کو تو جانتی ہو جنونی ٹھہرے" یہ اس طرح کہا جیسے کوئی بچہ جس کے سارے کھلونے ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے ہوں، اور ماں نئے کھلونے منگانے سے انکار کر دے۔
میرے حلق میں سوکھا سوکھا پھندا پڑنے لگا۔
"چھٹیاں ہیں؟"
"نہیں تو لیکر آیا ہوں"
"کیوں"
"ایک ضروری کام تھا۔"

"آپ کو اور کام ۹- دہلی گئے ہوتے تو قریب پڑتا" میں نے تنگ کرنا شروع کیا۔

"ہاں —— وہ —— میں نے اسٹیشن پر اخبار دیکھا تھا۔ مبارک باد دینا تو بھول ہی گیا" کھسیانی ہنسی۔

"اوہو تو اس لئے آئے ہوں گے آپ۔ شکریہ۔ منظور سے تو آپ کو ہمدردی ہوگی نا؟"

"ہاہاہا۔ خود کردہ را علاجے نیست۔ کس نے کہا تھا اُس سے کہ دریا میں کود۔ اب کودا ہے تو ہاتھ پاؤں مارے" وہ کریہہ قہقہہ جسے سن کر مجھے ہسٹریا کا دورہ پڑنے لگتا ہے، اپنے مخصوص جھکولوں کے ساتھ گونجا۔ مگر میں نے ضبط کیا۔

"مارچ میں شادی ہو جائے گی، سیدھے کشمیر چلے جائیں گے۔ وہاں برف ——" میں نے مصنوعی مسرت سے کہا۔ گو دل پر برف کے تودے جمے ہوئے تھے۔

"مگر منظور تو تمہیں پسند نہ تھے" وہ ایک دم بولے۔

"اوہ، وہ میری غلطی تھی —— وہ فرشتہ ہیں ——" میں نے کم از کم آخری لفظ تو دل سے کہے۔

"ہاں —— ہے تو —— پر کٹا فرشتہ" اور پھر وہی پاگل کُن "قہقہہ" بڑی جلدی فیصلہ کر لیتی ہو"

"ہاں ناقص العقل جو ٹھہرے ہم لوگ۔ خیر منظور جانتے ہیں —— وہ میری غلطیوں سے بھی پیار رکھتے ہیں"

"بڑے عقلمند ہیں پھر تو!" ایسے طعن سے کہا کہ میرا جی چاہا منہ نوچ لوں بیوقوف کا۔ مگر پس بولے ہی گئی" وہ فرشتہ ہیں —— میں نے تو اُن سے کہدیا تھا —— یہاں تک کہدیا تھا ——"

"کیا کہدیا تھا" وہ ریڈیو پر دور کا کوئی اسٹیشن لگا کر بولے۔

شکر تھا کہ لمپ ذرا آڑ میں تھا - اور مجھے تاریکی نے اپنی پناہ میں لے رکھا تھا - میرا جتی ذرا آگے کو جُھکا - اسٹول پر بیٹھا تھا - بے ترتیب بال - باغیانہ ڈھٹائی سے پیشانی کی طرف جھکے ہوئے تھے - چوڑے شانے لمپ کی روشنی سے میرے چہرے کو چھپائے ہوئے تھے - ہونٹوں پر وہی کچھ تلخ سی مُسکراہٹ ، میرا دل بُری طرح گھبرانے لگا - میں نے بمشکل اس سِسکی کو روکا جو میرے ہونٹوں پر مچل رہی تھی - ریڈیو کی آواز اونچی کرنے کے لئے میں نے ہاتھ بڑھایا اور اُدھر سے اُنہوں نے - تھوڑی دیر کے لئے میری اُنگلی اُن کے گرم ہاتھوں سے مس ہوگئی اور مجھے ایسا معلوم ہوا ریڈیو (LEAK) کر رہا ہے - میری آنکھوں میں تارے ناچنے لگے - اور منظور کی انگوٹھی اس کی گرمی سے پگھلتی ہوئی معلوم ہوئی - مگر میں نے سختی سے اُس ایکٹر کی طرح شروع کیا جو اپنا پارٹ شروع ہی سے بھول چکا ہو - اور ہال میں بدتمیز دو آنے والے تماشائی تالیاں بجانے آئے ہوں "

"کچھ بھی ہو ـــــ انہوں نے تو یہ تک کہدیا ـــــ میں نے جب کہا کہ میرا کیا بھروسہ ، شادی کے بعد ہی میں بدل جاؤں ، اور چل دوں گھر بار چھوڑ کے ـــــ تو وہ بولے ـــــ"

"کیا بولے ؟ " اُنہوں نے سکون سے کہا - اور لاپرواہی سے سگریٹ تلاش کرنے کے لئے جیبیں ٹٹولنا شروع کر دیں -

" اوہ - منظور فرشتہ ہے ، اُس نے کہا - تم چلی جانا - میں بچوں کو پال لوں گا " میرے گلے میں آواز اٹک گئی -

" ہیں ؟ ـــــ کیا ؟ ـــــ کیا کہا ـــــ پھر تم نے کیا کہا " خواہ مخواہ میرا دل دکھانے کیلئے حیرت کا اظہار کرنا تو اس کی خصلت میں داخل ہے -

" پھر کیا ؟ ـــــ مجھے عمر میں پہلی مرتبہ اسوقت منظور پر پیار آیا ـــــ اور ـــــ"

"کیا ؟ تمہیں ـــــ پیار ـــــ آیا !!! "

"اور کیا، وہ ہے ہی پرستش کے قابل - اور کیا کرتی ہیں"

"تم نے اُسے گھر سے نکلوا دیا ہوتا، لاحول ولا قوۃ!"

"کیوں؟"

وہ تھوڑی دیر حیرت سے مُنہ پھاڑے بیٹھا رہا - کمبخت کی شکل باوجود ان باتوں کے کس قدر جاذبِ نظر تھی، اُس نے اپنا اسٹول میرے بالکل قریب گھسیٹ لیا لیکن میں صوفے کے آخر کونے پر کھسک گئی - اوہ خدا میں خود کو کس قدر محفوظ سمجھ کر اور سکون سے بیٹھی تھی - تین ہفتے تین صدیوں کی طرح کٹے تھے - پر گذر تو چکے تھے - اور اب جب میں نے اپنی پناہ کی جگہ ڈھونڈ لی، تو یہ پھر مجھے بہکانے آ گیا - شیطان سانپ کا بھیس بدل کر حوّا کو بہکانے آیا تھا - اور پھر وہ ——— میں نے خود کو ہوش میں لانے کے لئے زور سے اپنی ران میں چٹکی بھر لی - اور دانت بھینچ لئے -

"تم عورت ہو" وہ سختی سے بولا -

"یقیناً" میں نے وثوق سے کہا -

"اور پھر تم مجھ سے پوچھتی ہو ——— کہ کیوں؟"

"یہ کوئی بات نہیں ہوئی - تمہاری دلیل بالکل فضول ہے"

"کیا تم واقعی اُسے پسند کرتی ہو؟ ——— میرا مطلب ہے منظور کو" وہ ایکدم بولے -

"کس قدر واہیات سوال ہے" میں نے حقارت سے کہا "اور ———"

"مگر ——— میں سوچتا ہوں ———" اُس نے اپنا ہاتھ صوفے پر پھیرتے ہوئے کہا -

"کیا سوچتے ہیں آپ" میں نے رکھائی سے کہا -

وہ اور بھی قریب آ گیا - میں اُٹھ کر بیٹھ گئی -

"میں سوچتا ہوں" آواز میں کسیقدر نرمی تھی" میں یہ کہنے آیا تھا کہ میں غلطی پر تھا جنگل بڑے بھیانک ہوتے ہیں خصوصاً تنہائی میں —— سنو تو ——" مجھے بولنے سے روک دیا" میں تنہائی نہیں پسند کرتا —— اب پسند نہیں کرتا —— سنو تو میرا وہاں بہت دل گھبراتا ہے"

"ہوں" میں نے بالکل اُنہیں کی طرح لاپرواہی سے کہا۔

"میں —— دیکھو بچے ویچے کچھ نہیں پالوں گا۔ اگر تم اُن کو چھوڑ کر چلی گئیں، تو اُنہیں روز پلّوں کی طرح پیٹوں گا۔ اور ——" پھر بھنّا اٹھا۔

میں بمشکل اپنی ہنسی گھونٹ سکی۔

"اور یہ ناممکن کہ تم مجھے چھوڑ کر جا سکو"

"کیوں؟ —— یہ کیوں؟" میں نے کہا۔

"یہ یوں کہ —— کہ —— میں —— چھوڑو بھی اِس بات کو —— لاحول ولا قوۃ۔ ایک دفعہ مجھ سے شادی کرنے کے بعد —— وہ بالکل قریب جُھک گیا۔

"کون بے وقوف تم سے شادی کر رہا ہے —— ذرا ہوش میں" میں نے پیچھے سرک کر کہا۔

"تم سنتی تو ہو نہیں —— میرا وہاں بہت دل گھبراتا ہے۔ اور میں ——" پھر بچوں کی طرح کہا۔

"تو میں کیا کروں۔ بلا سے گھبرائے آپ کا دل۔ جی ہاں سمجھے کیا؟"

"بڑی خوبصورت جگہ ہے، تم کہو گی کہ بس جنت ہے۔ سرور سے آنکھیں نیم باز کر کے کہا۔

"بس معاف رکھئے اپنی جنت سے" میری آواز کمزور تھی۔

"ہیں! —— ایک بات سنو" اُنہوں نے اپنا دہکتا ہوا گرم ہاتھ میرے ہاتھ

پیر رکھکر کہا۔

"ہاں - کیا ؟" میں نے کہا - اور سنسنی آنے لگی - ہلکی ہلکی کمزوری بڑھنا شروع ہوئی۔

"تم ــــ سب کچھ سمجھتی ہو ــــ کیوں ہے نا ؟ پربتی ہو" وہ اور آگے کو جھکے۔ صوفے پر پیچھے سرکنے کی جگہ بھی تو نہ تھی۔

"اونہہ ــــ بھئی" میں نے صدائے احتجاج بلند کی - مگر ایک تھکے ہوئے بچے کی طرح انہوں نے میری گود میں سر ڈالدیا - اسوقت :-

"گھر - گھر پھٹ شوں - فش" باہر برآمدے میں موٹر بھنّا رہی تھی ــــ !

"ارے پنکچر !" منظور کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی - اور ہم چوروں کیطرح ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

سورج کچھ ایسے زاویہ پر پہونچ گیا کہ معلوم ہوتا تھا چھ سات سورج ہیں جو تاک تاک کر بڑھیا کے گھر میں ہی گرمی اور روشنی پہونچانے پر تلے ہوئے ہیں۔ تین دفعہ کھٹولی دھوپ کے رخ سے گھسیٹی اور اُسے لو وہ پھر پیروں پہ دھوپ۔ اور جو ذرا اونگھنے کی کوشش کی تو دھا دھم اور ٹھٹوں کی آواز چھت پر سے آئی۔

خدا غارت کرے پیاروں پیٹی کو۔" ساس نے بیچیا بہو کو کوسا جو محلے کے چھوکروں کے سنگ چھت پر آنکھ مچولی اور کبڈی اڑا رہی تھی۔

دنیا میں ایسی بہوئیں ہوں تو کوئی کاہے کو جئے۔ اے لو دوپہر ہوئی اور لاڈو چڑھ گئیں کوٹھے پر ذرا ذرا سے چھوکرے اور چھوکریوں کا دل آن پہونچا۔ پھر کیا مجال ہے جو کوئی آنکھ جھپکا سکے۔

"بہو.... ق.... " بڑھیا نے بلغم بھرے حلق کو کھڑکھڑا کر کہا "اری او.... بہو!"

"جی آئی" بہو نے بہت سی آوازوں کے جواب میں کہا۔ اور پھر وہی دھا دھم۔ جیسے کھوپڑی پر بھوت ناچ رہے ہیں۔

"ارے تو آچک خدا لیجے تجھ سے" اور دھم دھم چھن چھن کرتی بہو سیڑھیوں پر سے

اُتری اور اُس کے پیچھے کتّوں کی ٹولی۔ ننگے، اَدھ ننگے، چیچک مُنہ داغ، ناکیں سُڑسڑاتے کوئی پون درجن بچّے، رکھی رکھی، رکھی رکھی۔ کھوں کھوں، سب کے سب کھمبوں کی آڑ میں شرما شرما کر ہنسنے لگے۔

"الٰہی یا تو ان حرامی پلّوں کو موت دے۔ یا میری مٹّی عزیز کر لے۔ نہ جانے یہ اُٹھائی گیرے کہاں سے مرنے کو آ جاتے ہیں —— چھوڑ دیئے ہیں جن جن کے ہماری چھاتی پہ مونگ دلنے کو ——" اور نہ جانے کیا کیا۔ پر بچّے مُسکرا مُسکرا کر ایک دوسرے کو گھونسے دکھاتے رہے۔

"میں کہتی ہوں تمہارے گھروں میں کیا آگ لگ گئی ہے —— ہو!"

"واہ۔ تم تو مر گئی تھیں!" بہو نے بستر پا کے کہنی کا ٹہوکا دیکر کہا۔

بڑھیا جملے کو اپنی طرف مخاطب سمجھ کر تلملا اٹھی۔

"جھاڑو پھیر دوں تیری صورت پہ۔ مریں تیرے ہوتے سوتے، تیرے ......"

"واں۔ ہم تمہیں کب کہہ رہے تھے!" بہو نے لاڈ سے ٹھنک کر کہا۔

مگر بڑھیا کوسے گئی۔ اور بچوں کو تو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ بچاروں کو منہ چڑا کر بھاگتے ہی بنی۔ اور بہو پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

"دُنیا جہان میں کسی کی بہو بیٹیاں یوں لونڈوں کے ساتھ گُدگُدے لگاتی ہوں گی؟ دن ہے تو لونڈھیار۔ رات ہے تو ......" ساس تو زندگی سے تنگ تھی۔

"غُن غُن۔ غُن غُن!" بہو منمنائی۔ اور طوطے کے پنجرے میں پنکھے سے تنکے نکال نکال کر ڈالنے لگی۔ "ٹیں ٹیں!" طوطا چنگھاڑا۔

"خاک پڑی اب یہ طوطے کو کیوں کھائے لیتی ہے!" ساس غرّائی۔

"تو یہ بولتا کیوں نہیں!" بہو نے جواب دیا۔

"تیری بلا سے۔ نہیں بولتا —— تیرے باپ کا کھاتا ہے!" —— ساس نے

پہلو بدل کر کہا۔

"ہم تو اسے بلائیں گے" بہونے اٹھلا کر طوطے کے پنجے میں تنکا کھینچ کر کہا۔

"آئیں ـــــ آئیں ـــــ اے میں کہتی ہوں تیرا جیتا ہی پگھل گیا ہے ۔اب ہٹتی ہے وہاں سے کہ لگاؤں" بڑھیانے دھمکی آمیز پہلو بدل کہا۔ اور جب بہونے اور سُلگایا تو کھٹائی کی شکل کی جوتی اٹھا کر ایسی تاک کر ماری کہ گھڑونچی کے نیچے سوئے ہوئے کتے کے لگی جو بلبلا کر بھاگا اور بہو کھل کھل کر کے ہنسنے لگی۔ بڑھیانے دوسری جوتی سنبھالی اور بہو کھمبے کی آڑ میں۔

"آنے دے اصغر کے بچے کو ـــــ"

"بچہ" ......" بہو کو بچے کے نام پر بجائے شرمانے کے ہنسی دبانا پڑی۔

"تھو ہے تیرے جنم پر۔ اسے اور کیا ۔ بچہ بھی آج کو ہو جاتا جو کوئی بُھاگوان آتی۔ جس دن سے قدم دھرا۔ گھر کا گھروا ہو گیا"

بہو اور مسکرائی اور طوطے کا پنجرہ جھکول ڈالا۔

"میں کہتی ہوں یہ طوطے کی جان کو کیوں آگئی ہے"

"تو یہ بولتا کیوں نہیں ـــــ ہم تو اسے بلائیں گے"

بڑھیا جل کر کوئلہ ہو گئی "یہی ڈھنگ رہے تو اللہ جانتا ہے دوسرا بیاہ کرلائی ہوں تو نام نہیں ـــــ"

دھوپ ڈھل کر گھڑونچی اور وہاں سے کنڈیلی پر پہونچی۔

ساس بڑبڑاتی رہی "موئے نفقتے بیٹی کو کیا جہیز دیا تھا ـــــ اے واہ قربان جائیے۔ خولی کرتے۔ اور ہاتھ کی بالیاں۔ اور ......"

"تو ہم کیا کریں" بہو پھوٹ پڑے سے بڑبڑائی اور کھٹولی پر بیٹھ کر لیٹ گئی۔

"اور وہ ایلومونیم کے ......" برتن لیکر بڑھیا نے پٹاری پر سر رکھکر ذرا ٹانگیں

پھیلا کر کہا —— اور پھر سونے سے پہلے وہ سمدھنوں کے گھٹنوں پر سے گھسے ہوئے گلبدن کے پاجاموں، پھیکے زردے اور گھنے ہوئے پایوں والے جہیز کے پلنگ کا ذکر کرتی رہی۔ مگر بیچاری بہو آدھی کھٹولی پر اور آدھی زمین پر لٹک کر سو بھی گئی۔

بڑھیا کی بڑبڑاہٹ بھی خراٹوں میں نہ جانے کب بدل گئی

اصغر نے چھتری کو کھمبے سے لگا کر کھڑا کیا اور کتھئی چھپائی والی نیلی واسکٹ کو اتار کر کرتے سے پسینے کے آبشار پونچھتے ہوئے دالان میں قدم رکھا۔ پہلے بڑی احتیاط سے ایک شریر بچے کی طرح روٹھ کر سوئی ہوئی بڑھیا پر نظر ڈالی۔ اور پھر بہو پر۔ آموں اور خربوزوں کی پوٹلی کو زمین پر رکھ کر کچھ سر کھجایا اور جھک کر بہو کی بانہہ کھینچ دی۔

" اوں —— " بہو تیوریاں چڑھا کر اینٹھی۔ اور اس کا ہاتھ جھٹک مڑ کر سو گئی۔

اصغر نے پوٹلی اٹھائی۔ جیب میں نئی چوڑیوں کی پڑیا ٹٹولتا کوٹھری میں چلا گیا۔ بہو نے ہوشیار بلی کی طرح سر اچکا کر بڑھیا کو دیکھا اور دوپٹہ کڑ کھڑاتی جھپاک سے کوٹھری میں۔

لو، رک گئی۔ پسینے کے شرّاٹے چل نکلے۔ مکھیاں آموں کے چھلکوں اور کوڑے سے نیت بھر کے منہ کا مزہ بدلنے بڑھیا کے اوپر رینگنے لگیں۔ دو چار نے باچھوں میں بہی ہوئی پیک کو چکھنا شروع کیا۔ دو چار آنکھوں کے کوئے میں تندہی سے گھسنے لگیں.... کوٹھری میں سے ایک گڑگڑاتی ہوئی بھاری آواز اور دوسری چنچناہٹ " اوں —— اوں" سنائی دیتی رہی۔ ساتھ ساتھ خربوزوں کے چھلکوں اور آموں کے چچوڑنے کی چپڑ چپڑ آواز سکون کو توڑتی رہی۔

مکھیوں کی چہلوں سے دکھی ہو کر آخر بڑھیا پھڑپھڑا ہی اٹھی۔ یہ مکھی ذات جی کے ساتھ لگی تھی —— پیدا ہوتے ہی گھٹی کی چپچپاہٹ سونگھ کر جو مکھیاں منہ پر بیٹھنا شروع ہوئیں تو کیا سوتے کیا جاگتے بس آنکھ ناک اور ہونٹوں کی طرح یہ بھی جسم

کا ایک عضو بن کر ساتھ ہی رہتی تھیں —— اور ایک مکھی تو نہ جانے سالہا سال سے اُس کی دشمن ہو گئی تھی۔ جب لکھنؤ میں تھی جب کاٹا —— پھر جب اُناؤ گئی تو برسات میں پھر کاٹا۔ اور لو سندیلہ میں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اگر بڑھیا کو معلوم ہوتا کہ اسے اسکے جسم کے کونسے مخصوص حصے سے اُنس ہے۔ تو وہ ضرور وہ حصہ کاٹ کر مکھی کو دیدیتی۔ مگر وہ تو ہر حصہ پر ٹہلتی تھی۔ وہ کبھی کبھی غور سے اُسی خاص کٹکھنی مکھی کو دیکھتی۔ وہی چتلے پر، ٹیڑھی ٹانگیں اور مٹکا سا سر۔ وہ بڑے تاک کر پنکھے کا چھپا کا مارتی —— مکھی تنن تنن کرکے وہ گئی —— آہ معبود! اُسے کتنا ارمان تھا کہ وہ کبھی تو اس مکھی کو مار سکے —— لنگڑا ہی کر دے۔ اس کا بازو مروڑ کر مُرغی کی طرح گدّی باندھ کر ڈالدے اور مزے سے پاندان کے ڈھکنے پر رکھکر تڑپنا دیکھے۔ مگر خدا تو شاید اس مکھی سے بھی شیطان کیطرح قول ہارے بیٹھا تھا کہ بس ستائے جائے۔ اُس کی ایک حقیر بندی کو نہ جانے اِس میں کیا مزہ آتا ہے۔ مگر اُسے یقین تھا کہ اس دوزخی مکھی کا گریبان —— اس مکھی کی فریاد ضرور اس قہار و جبّار کی حضور میں لیکر جائے گی اور ضرور فرشتے اُسے خون پیپ پلا کر کانٹوں پر سلائیں گے .... مگر پھر .... کیا یہ مونڈی کاٹی مکھیاں بھی جنّت میں جائیں گی! —— اور ساری جنتی فضا مکدّر ہو جائیگی۔ بڑھیا نے پنکھے کی پتوار بنا کر چھپا چھپ اپنے مُنہ، ہاتھوں اور سوکھے پیروں کو پیٹ ڈالا۔

"بہو —— اے بہو۔ مر گئی کیا" وہ جلکر چلائی۔

اور بہو تڑپ کر کوٹھری سے نکلی۔ دوپٹہ ندارد، گریبان چاک۔ ہاتھ میں آم کی گٹھلی، جیسے کشتی سے کشتی لڑ رہی ہو —— پھر فوراً لوٹ گئی اور دوپٹہ کندھوں پر ڈالے آنچل سے ہاتھ پونچھتی نکلی۔

"ارے بہو —— میں کہتی ہوں —— ارے دو بوند حلق میں پانی"

اصغر بھی شلوار کے پائنچے جھاڑتا کرتے کی پوٹلی سے گردن رگڑتا آیا۔

"لو اماں —— کیا خوشبودار امیاں ہیں" اُس نے بڑھیا کی گود میں پوٹلی ڈال کہا۔ اور کھٹولی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

بڑھیا آموں اور خربوزوں کو سونگھ سونگھ کر بکھیوں کی ناانصافی کو بھول گئی۔ جو اب آموں کی بونڈیوں کا معائنہ کرنے کیلئے اُس کی باچھوں سے اُتر آئی تھیں۔

"اے بہو چھُری ....."

بہو نے گلاس دیتے ہوئے آموں کا رس ہونٹوں پر سے چاٹا۔ اصغر نے پیر بڑھا کر بہو کی پنڈلی میں بکچّا بھر لیا۔ پانی چھلکا اور بڑھیا غرّائی۔

"اندھی۔ میرے پاؤں پر اوندھائے دیتی ہے" اور ایسا کھینچکر ہاتھ مارا کہ گلاس معہ بھاری پیندے کے بہو کے پیر پر۔ بہو نے دانت کچکچا کر اصغر کو گھورا۔ اور چلدی تنتنائی۔

"اماں لو پانی" اصغر نے فرمانبردار بیٹے کی طرح پیار سے کہا "یہ بہو تو بڑی وہ ہوگئی"

"تمہیں دیکھو" بڑھیا نے شکایت کی۔

"نکال دو مار کے حرامزادی کو۔ اماں اب دوسری لائیں۔ یہ تو ——" اصغر نے پیار سے بہو کو دیکھکر کہا۔

"اے زبان سنبھال کمینے!" بڑھیا نے آم پلپلا کر کہا۔

"کیوں اماں؟ - دیکھو نا کھا کھا کر بھینس ہو رہی ہے" اُس نے بڑھیا کی آنکھ بچا کر کمر میں چٹکی بھر کر کہا۔ اور بہو نے چھُری مارنے کی دھمکی دیتے ہوئے چھُری بڑھیا کے گٹّے پر پٹخ دی۔ جو تلملا گئی۔

"دیکھتی ہو اماں —— اب ماروں چڑیل کو" اور لپک کر اصغر نے دیا دھموکہ بہو کی پیٹھ پر۔ اور فرمانبردار بیٹے کی طرح پھر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"خبردار، لو —— اور سنو۔ ہاتھ توڑ کے رکھ دوں گی ابکے جو تو نے ہاتھ اُٹھایا"

بڑھیا غنیم کی طرفداری کرنے لگی "کوئی لائی بھگائی ہے... جو تو —— اسے میں کہتی ہوں پانی لادے" اُس نے ایکدم پھر بہو پر برسنا شروع کیا۔

بہو کھمبے سے لگ کر منہ تھوتھا کر بیٹھ گئی اور گلاس سے زخمی ہوئے انگوٹھے کو دبا دبا کر خون نکالنے لگی۔ بڑھیا مزے سے گٹھلیاں چوڑا کی اور پھر شکر کا ڈبہ دیتے وقت کچھ ایسا بڑھا کے پاؤں رکھا کہ خون سے لتھڑا انگوٹھا بڑھیا نے دیکھ ہی لیا۔

"اُوئی یہ خون کیسا ؟" پر بہو روٹھ کر پھر کھمبے سے لگ کر بیٹھ گئی اور خون بہنے دیا۔

"اسے میں کہتی ہوں ادھر آ۔ دیکھوں تو خون کیسا ہے ؟" بڑھیا نے پریشانی چھپا کر کہا۔

بہو ہلی تک نہیں۔

"دیکھو تو۔ کیسا جیتا جیتا خون نکل رہا ہے۔ اصغر اُٹھ تو ذرا اسکے پیر پہ ٹھنڈا پانی ڈال" سانس بھی گرگٹ ہوتی ہے۔

"میں تو نہیں ڈالتا" اصغر نے ناک سکوڑ کر کہا۔

"حرامزادہ!" بڑھیا تو دگھٹتی ہوئی اُٹھی۔

"چل بیٹی پلنگ پر۔ اسے میں کہتی ہوں یہ گلاس موا سوا سیر کا ہے۔ اِس کمبخت سے کتنا کہا اپنا المونیم کا لادے۔ مگر وہ ایک حرامخور ہے۔ لے اُٹھ ذرا" بہو ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ہاں گھونی آگے کر کے جھوٹ موٹ ناک دوپٹے سے پونچھنے لگی۔

"لا پانی ڈال صراحی میں سے" اور اصغر سینے پر پتھر رکھکر اٹھا۔

بڑھیا سوکھے سوکھے لرزتے ہاتھوں سے خون دھونے لگی۔ مگر یہ معلوم کرکے کہ بجائے زخم پر پانی ڈالنے کے وہ چپکے گریبان میں دھار ڈال رہا ہے اور بہو اس تاک میں ہے کہ قریب آتے ہی اصغر کا کان دانتوں سے چبا ڈالے۔ وہ ایکدم بکھر گئی۔

"خاک پڑے تیری صورت پر!" بڑھیا نے اصغر کے ننگے شانے پر سوکھے پنجے سے بدھیا ڈال کر کہا۔ اور اس نے ایک سسکی لیکر جل کر سارا پانی بہو پر لوٹ دیا اور خود روٹھ کر آم کھانے چلا گیا۔ ماں بیٹے کے لئے ڈھائی گھڑی کی موت آنے کا ارمان کرنے لگی۔

"بدذات۔ ٹھہر جا۔ آنے دے۔ اپنے چچا کو وہ کھال اُدھڑوائی ہو کہ بس ——"
بڑھیا نے میلی دھجی کی پٹی باندھ کر کہا۔

"لے بس اب پلنگ پر لیٹ جا" بڑھیا نے زخم کو انتہائی خطرناک بنا کر کہا۔ اور پھر بہو کے نہ ہلنے پر خود ہی بولی "اے ہاں —— لے اصغر بہو کو کھٹولی پر پہونچا دے"

"مجھ سے تو نہیں اُٹھتی۔ یہ موٹی بھینس کی بھینس" اصغر جل کر بولا۔

"ارے تیرے تو باپ سے اُٹھے گی —— سنتا ہے کہ اب ——"

اور جب وہ پھر بھی بیٹھا رہا تو بڑھیا خود اُٹھانے لگی۔

"اماں۔ میں آپ اُٹھ جاؤں گی" بہو نے بڑھیا کی گدگدیوں سے گھبرا کر کہا۔

"نہیں بیٹی —— میں ——" اور اس نے پھر اصغر کی طرف آنکھیں گھما کر دیکھا گویا کہہ رہی ہے ٹھہر جاؤ میاں دو دوھ نہ بخشوں اور پر نہ بخشوں۔

اصغر بھنا کر اُٹھا اور ایک جھپاکے سے بہو کو اُٹھا کر چلا کھٹولی کی طرف۔ بہو نے موقع کی مناسبت سے فوراً فائدہ اُٹھا کر اُسی جگہ دانت گاڑ دیئے۔ جہاں ابھی ساس کا سوکھا پنجہ پڑا تھا۔ اور اصغر نے کچکچا کر اُسے کھٹولی پر پٹخ دیا اور اسکے سُرخ سُرخ ہونٹ چٹکی سے مسل دیئے۔

بہو ناک پھُپھا پھُپھا کر فخریہ طریقہ پر ہنستی رہی اور اصغر اپنے نیل پڑے ہوئے کندھے کو سہلا سہلا کر غرّاتا رہا —— ساس وضو کے آخری مراحل طے کر رہی تھی اور آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر کچھ بڑبڑا رہی تھی —— جانے کیا۔ شاید بیچارا بہو کو کوس ہی ہوگی۔

کاش یہ ریلیں ذرا کم ہلا کرتیں! گھڑ گھڑ۔ پھٹ پھٹ۔ جھڑ جھڑ۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہیے اب نکلے اور اب نکلے۔ ریل میں بیٹھ کر انسان کن کن عجیب و غریب زاویوں سے ہلتا ہے۔ آڑا ترچھا۔ پھر گول گول چکروں کی صورت میں اور پھر شمال سے جنوب کی طرف اور کندھے مشرق اور مغرب کی سمتوں میں جنبش کرتے ہیں۔ اور لٹکی ہوئی ٹانگیں۔ مثلث بنانا شروع کر دیتی ہیں۔ پانی کا گلاس کئی دفعہ نشانہ باندھنے کے باوجود بھی کبھی ٹھوڑی اور کبھی ناک سے ٹکرا کر پانی چھلکا دیتا ہے۔ اِس سے تو چھکڑے ہزار درجہ بھلے تھے جب چلتے چلتے انسان تھک جائے تو ٹھہر تو سکتا ہے۔ مگر یہاں ریل میں تو بس ہلو، ہلو اور پاگل ہو جاؤ۔

سامنے بیٹھا ہوا انسان ہلنے کے ساتھ ساتھ پھسلنے بھی لگا۔ اُس کی ٹانگ جو پہلے ہی ران تک کھلی ہوئی تھی اور بھی آگے کھلنے لگی۔ نہ جانے کس عجیب طریقہ سے دھوتی باندھی تھی کہ گز زیادہ کپڑا لپٹا ہونے کے باوجود ہر جنبش خطرناک طور پر اُسے برہنہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ کاش وہ جاگ جائے ... میں نے دعا مانگنا شروع کی۔ کاش وہ ایکدم ہی تڑپ کر اُس کپڑوں کی گٹھڑی میں سے نکل آئے! پسک پسک کر جو اُس کی دھوتی برابر کھسک رہی ہے اِس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ ایک دم فیصلہ کر دے! تین

اسٹیشنوں سے یہی جاں کنی سی طاری ہے۔ بڑی معیوب سی بات ہے۔ لیکن ایسے موقع پر خواہ مخواہ نظر اٹھتی ہے اور ہے یہ بڑی عجیب بات کہ کوئی اُسے کچھ نہیں کہتا۔

میری سیٹ سے ذرا ہٹ کر ایک پوری سیٹ لبالب ایک عورت سے بھری ہوئی تھی۔ پہاڑ کی پہاڑ عورت نہ جانے کیسے ایک بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ ساری رات بچہ دودھ پیتا رہا اور وہ بالکل غافل سوتی رہی۔ جب کوئی اسٹیشن آجاتا تو بچہ کوں کوں کرکے چپڑ چپڑ منہ مارنے لگتا۔ عورت کا پلپلا پلپلا جسم ہر جنبش پر مختلف سمتوں میں ہل رہا تھا۔ بچہ پیٹ پر چھپکلی کی طرح چپکا ہوا برابر دودھ پی رہا تھا۔ گویا وہ پیدا ہی اس ضروری کام کے لئے ہوا ہے۔ وہ رات بھر دودھ پیتا رہا۔ اب پی رہا تھا اور نہ جانے اسے ابھی کتنا اور پینا تھا۔ اوندھا ہونے کی وجہ سے اُس کی ناک پچکی جاتی تھی جس میں سے غلاظت کے بُلبلے نکل کر ہوا میں پھوٹ رہے تھے۔

کاش بچّہ ذرا دودھ کم پیتا۔ اور وہ ننگی ٹانگ والا مسافر دھوتی سنبھال لیتا تو میرا سفر اتنا تلخ نہ ہوتا۔ ریل کے جھٹکوں نے نئے زاویے اختیار کر لیے تھے اور جسم کو ذرا مختلف اطراف میں ہلنے میں نسبتاً سکون مل رہا تھا۔

جبتک ریل چلتی رہتی ہے۔ ڈبہ کی بدبو ذرا دبی رہتی ہے۔ ریل رُکتے ہی پسینہ اور میلے کپڑوں کے بھبکے اٹھنے لگے۔ باہر چند بے فکرے نوجوانوں نے ٹہلنا شروع کیا! کاش کوئی ہمارے نوجوانوں کو آوارگی سکھا سکتا۔ جی ہاں آوارگی بھی ایک ہنر ہے! مجھے یاد ہے کہ چوراہے پر سے گذرتے وقت ایک انگریز سپاہی کھڑا رہتا تھا۔ بڑی شرم کی بات ہے۔ پر وہ کچھ اس مزے سے "ٹوٹی" کرکے سیٹی بجاتا تھا کہ لطف آجاتا تھا اور اسکی کرنجی آنکھ شرارت سے جھپکتی تھی۔ تو ہم لوگ بے اختیار مسکرا دیتے تھے۔ ذرا غور کیجئے۔ بچّہ، مسافر، جس کی دھوتی نئی کروٹ لینے کے بعد اور بھی خطرناک ہو چلی تھی۔ ریل کے ہچکولے اور پھر غلط فہمی کا شکار، بیسویں صدی کے نوجوانوں کی بدمذاقی

جی چاہا - ان میں سے ایک کو بلا کر کہوں "بھائی - یہ شعر جو تو گنگنا رہا ہے بہت پرانا ہے۔ "شعلۂ طور" میں سے کوئی جلتا ہوا شعر پکڑ اور تیرے بالوں میں جو آونلے کا تیل ہے - آدھ درجن سروں کے لئے کافی ہوتا - اور تیری بائیں مونچھ دائیں مونچھ سے ذرا اونچی کٹی ہے - اُبھر اُبھر کر تیرے ذوق کی داد دے رہی ہے۔ اور پان اتنا مت چبا - تیری کچلیاں بہت نمایاں ہیں - پان کی پیک میں لتھڑ کر بڑی بھیانک ہو رہی ہیں - اور تو اتنی ڈھیلی دھوتی مت پہن - اور کرتا بھی بہت بڑا ہے - یہ جو تو نے سینما میں اشوک کمار وغیرہ کو بے گریبان کے بڑے بڑے تھیلے پہنے دیکھا ہے وہ تیرے اِس ٹھنگنے سے قد پر اچھے نہیں لگتے - اور ..... " مگر وہ ایک نئی بیاہی دُلہن کو ڈبے میں سے جھانکتے دیکھ کر عجیب بھیانک حرکتیں کرنے میں مشغول - بھلا میری کیوں سُنے گا - آہ - میری آنکھیں! جی چاہا مٹھی بھر کے ریت اُٹھا کر جھونک لوں۔ ریل کا کوئلہ نہ جانے کتنا گھس گیا! میرا جی بُری طرح متلا رہا تھا - معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سارا دودھ جو وہ بچہ پی رہا ہے اور پی چکا ہے میرے ہی حلق سے گذر رہا ہے اور منہ کا مزا بدلنے کے لئے میں نے ڈلیا میں سے تنکے توڑ کر چبانا شروع کئے -

وہ قلی ہنسی مذاق میں باہم گتھم گتھا عجیب و غریب گالیاں دے رہے تھے - میں نے سوچنا شروع کیا کہ دوسری قوموں کی گالیاں بھولی اور غیر دلچسپ ہوتی ہیں - ہندوستانی دماغ کم از کم گالیوں کی ایجاد میں تو سب قوموں سے آگے ہے - جس نکتہ پر ہمارے یہاں گالیوں میں زیادہ زور دیا جاتا ہے - اُس کا اور لوگوں کو گمان ہی نہیں - ہزاروں آرٹ تو دُنیا میں لاپروائی کا شکار ہو جاتے ہیں - اور ہمارے ہندوستانیوں کے آرٹ کو تباہ ہی کر ڈالا گیا - انگوٹھے کاٹ ڈالے گئے کپڑا بنانے والوں کے - آپ اُس بچہ ہی کو لیجئے اور اُس کی ماں کو - جو اٹھارہ گھنٹے سے دودھ پی رہا ہے - فی گھنٹہ حساب لگایئے تو کتنا پی چکا ہوگا - اور وہ

ماں! اگر کسی تہذیب یافتہ ملک میں ہوتی، تو نہ جانے کتنے تمغے اور میڈل مل چکے ہوتے اور مجھے بڑے بڑے حروف میں بچے اور ماں کی حیرت انگیز حرکتوں کے متعلق "سنسنی خیز" الفاظ نظر آنے لگے۔ دُبلا پتلا بچہ! باوجود اس تندہی سے جُتتے رہنے کے حیرت! حیرت زدہ ہوتے ہوتے میرا سر دکھنے لگا۔ اور میں نے اونگھنے کی کوشش کی۔

کھٹ کھٹ کھٹ۔ کسی نے سر پر ہتھوڑے مارنے شروع کئے۔ ٹکٹ بابو صاحب اپنا سروتا کھڑکی کے پاس کھٹا کھٹا رہے تھے۔ تھرڈ کلاس میں سفر کرنے والوں کے نہ تو شاید بھیجا ہوتا ہے۔ اور نہ اُس میں احساس! جی چاہا پاگل ہو جاؤں۔

پاس ہی سکنڈ کلاس میں ایک کھدر پوش لیڈر نہ جانے رات کو کون سے اسٹیشن پر سوار ہو گئے تھے۔ جب وہ اسٹیشن پر اُتر کر سر کھجاتے یا اخبار خریدتے تو میں برابر اُنہیں غور سے دیکھتی۔ اُنہیں دنوں میں ایک کتاب پڑھ رہی تھی جس میں ایک معمولی عورت نے ایک بڑے مشہور آدمی پر طاری ہونا شروع کیا۔ اور ایسی پیچھے لگی کہ آخر میں نے اُسے مرعوب کر کے چھوڑا۔ میرا ارادہ بھی ہمیشہ ہی سے کوئی آن ہونی اور سنسنی خیز حرکت کرنے کا ہے۔ جو اور عام لڑکیوں نے نہ کی ہو۔ پہلے میں سوچا کرتی تھی۔ ایڈیٹر یا کوئی مشہور مصنف ٹھیک رہے گا۔ پھر میری رائے بدل گئی۔ آجکل لیڈر ذرا آنکھوں میں جچتے ہیں۔

اور ان لیڈر صاحب کی آنکھیں بڑی بڑی۔ کھلی ہوئی پیشانی۔ دھوتی کے پلّو سے کھیلتے ہوئے۔ وہ خاصے شریف آدمی معلوم ہو رہے تھے۔ کنپٹیوں پر سفید سفید بال جھلک رہے تھے۔ جو ان کے "مفکر" ہونے کا ثبوت دے رہے تھے جنکشن پر میں نے جان بوجھ کر بُک اسٹال پر اُن سے ملاقات کر لی۔

"ہماری استریاں ہی ہمیں آزاد کرا سکتی ہیں" انہوں نے میری ساری کے موٹے کھدر سے مرعوب ہو کر کہا۔ دل میں تو مجھے شرم آئی کہ ساری لیتے وقت میں نے ململ بہتری سے زیادہ اسٹائل پر توجہ دی تھی۔ مگر انہیں کیا معلوم۔

میں نے جلدی جلدی اُن سے نصیحتیں لینا شروع کیں۔

"صاحب عورتوں کی مدد کے بغیر ہندوستان آزاد نہیں ہوسکتا"

مجھے یاد آگیا۔ جب کالج کے زمانہ میں ایک دفعہ خوش رنگ جھنڈے لیکر ہم لوگ کھدّر کی ساریاں پہنکر نکلی تھیں۔ سلطانہ کی پیلے رنگ کی ساری بھیانک معلوم ہورہی تھی۔ اور شَشّی نے اپنی مور کے رنگ کی ساری سنبھالتے ہوئے مجھے جلوس کے درمیان میں ہی اُس کی ساری کے رنگ پر توجہ دلائی تھی۔ اور اُسوقت سلطانہ کے کانوں پر پڑے ہوئے بال بالکل کنٹوپ کی طرح معلوم ہورہے تھے۔ ہاں زینب غضب کی لگ رہی تھی۔ پردہ راستہ بھر نریندر صاحب سے فس کرتی گئی تھی۔ جوگی بیچاری نے شَشّی سے کتنی دفعہ ساری مانگی۔ مگر شَشّی کی ساری ساریاں جلوس والی لڑکیوں نے پہلے ہی لے لی تھیں اور وہ اُسی روز نئی کھدر کی ساری لائی۔ جس کے کلف کی بُو سے ناک اُڑی جارہی تھی۔ "استریوں کو کسی دکھ کی پروا نہیں کرنا چاہیے"۔ وہ بولے

لیجئے! بھلا ہم لوگ دکھ کی پرواہ کرینگے۔ جلوس میں جاتے وقت دل سے دعائیں مانگ رہے تھے۔ کاش پولیس مزاحمت کرے۔ ورنہ یہ تو کچھ بات نہ ہوگی کہ جلوس نکلے اور یونہی گشت لگا کر چلا آئے۔ جوگی تو یہانتک کہتی تھی کہ کاش لاٹھی چارج ہو ہم پر! مگر وہ تو ہماری قسمت میں نہ تھا! پولیس کو جیسے ہمارے دل کا حال معلوم ہو۔ اور جلوس پھُسپھُسا ہی رہتا۔ اگر ایک جھگڑا نہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔ وہ کچھ "بندے ماترم" اور "ہندوستان ہمارا" پر رسہ کشی ہوئی یہ شَشّی کو کھانسی آگئی۔ یہ جھگڑا یونہی دب گیا۔

"جس بات میں عورتیں حصّہ نہ لیں۔ تو جانو گاڑی کا ایک پہیہ نہیں"

مجھے یاد آیا کہ بہت دن ہوئے میں نے ایک فلم دیکھا تھا۔ اُس میں سوائے ایک بوڑھی ہوٹل والی کے اور کوئی عورت نہ تھی۔ اس قدر غیر دلچسپ فلم تو میں نے ساری عمر نہیں دیکھا۔ ہم سارا وقت اسی انتظار میں رہے کہ اب کوئی عورت آئے اور اصل تماشہ

شروع ہو۔ اور سچ کہتی ہوں - ایک پہیہ کی گاڑی تو پھر بھی چل جائے وہ فلم تو ذرا بھی نہ چلا۔
اور پھر مجھے ایک دم خیال آیا کہ ہم لوگ زندگی کو گاڑی سے کیوں تشبیہہ دیتے ہیں۔ چکّی سے کیوں نہیں دیتے۔ یا چمٹے سے کیوں نہیں، یہ خیال بڑا بے تُکا تھا۔ پر آ گیا دل میں۔ اگر لیڈر صاحب کو میرے دل کی باتیں معلوم ہو جائیں تو بس نہ جانے کیا کرتے۔ وہ کتنی دیر تک ایک کوڑھ مغز سے سر مارتے رہے جس کے خیالات کا سر نہ پیر۔ مگر اسمیں میرا کیا قصور کہ ایک بات پر مجھے ہزاروں اُلٹی سیدھی باتیں یاد آجاتی ہیں۔

پھر کچھ موجودہ نظامِ تعلیم کا ذکر ہونے لگا - دو تین اور آکر سننے لگے۔ اُن میں سے ایک کی ناک سکڑے ہوئے لمبے چہرے پر عجب چیز لگ رہی تھی۔ گویا ریگستان پر ایک تنبو تنا ہوا ہے۔ دانت اُن کے بھی پھپھوندی لگے ہوئے تھے۔ میرا دل چاہا۔ کوئی اُنکے دانت مانجھ دے اور لیڈر کا لکچر سننے کے بجائے میں حیرت میں ڈوبی، یہ سوچ رہی تھی کہ اس شخص کی بیوی کیا کرتی ہوگی۔ کاش کوئی اُن کے دانت مانجھ دیتا!۔ اور میرا دل گھبرانے لگا۔ جی چاہا کسی نہایت خوبصورت آدمی کو دیکھوں جس کے دانت پھپھوندی چڑھے ہوئے نہ ہوں۔ اور جس کی ٹانگ دھوتی میں سے ران تک نہ کھلتی ہو۔ اور جس کے کپڑوں میں سے ہلکی ہلکی نپتلین کی خوشبو آرہی ہو۔ اور اُس کے سینہ پر سر رکھ کر اتنا روؤں کہ سارا کوئلہ جو راستہ بھر میری آنکھوں میں جھونکا گیا تھا دھل جائے اور بچےّ کے تصوّر سے جو میرا جی متلا یا تھا .... اور وہ تین آوارہ مزاج بننے کی کوشش کرتے ہوئے نوجوان !۔ قلی اور ان کی گالیاں - ریل کے ہچکولے ...... یہ دنیا ساکت ہو جائے ..... اور بس !۔

# اُسکے خواب

جہاں بھی ہو، سوتا ہو یا جاگتا، خواب برابر آتے رہتے ہیں۔ مزیدار چٹپٹے، پھیکے، سیٹھے، دُھندلے، روشن اور کبھی بالکل نظر ہی نہ آنے والے۔ خواب کسے نہیں آتے؟ اور وہ تو اب جوان تھا۔ وہ جب ہی جوان ہو گیا تھا جب مہترانی کی جوان بہو اُسے پرستان کی پری معلوم ہونے لگی تھی اور اس کی چیپڑ بھری پیلی آنکھیں نرگس مستانہ اور بدبودار ہونٹ عنبر نظر آنے لگے تھے۔ جب وہ اپنی پتلی کمر جو ٹھوس اور پتھریلی آنکھوں کے نیچے بھینس جیسی نظر آنے لگی تھی۔ مٹکاتی چلتی تو سینکڑوں مہتروں کا تو ذکر ہی کیا خود گوشت والے حاجی جی کا چھوٹا سالا۔ بُندو کا بدمعاش بھتیجا اور نہ جانے کون کون مچھلیوں کی طرح بلبلانے لگتے۔ اور دھوبن کا تو کہنا ہی کیا۔ اُس کی گندمی رنگت اور پھیلی ہوئی ناک، اسکی شاعرانہ نظروں کے تیر، اور جب وہ شرانداور بھکراند سے بسے ہوئے چیتھڑوں کا پوٹلا لیکر ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی گلی میں پڑی ہوئی نجاست سے ایڑیاں بچاتی، نکلتی تو نہ جانے کتنے جی لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

ہاں مگر وہ بھی تو جوان تھا اور پھر شاعرانہ طبیعت۔ نہ جانے یہ اللہ میاں شاعروں سے کیوں جلتے ہیں۔ ہزار بیچارا اُنہیں کی حمد و ثنا میں جُٹا رہتا ہے۔ مگر وہ ہیں کہ اُس سے جان بوجھ کر رد کھتے ہیں۔ آخر کیوں؟ سب کچھ پڑھ لکھ لینے کے بعد بھی اُسے

نوکری کیوں نہیں ملتی؟ ۔ ہو نہ ہو جیسے اُسے نوکری کی پرواہ ہے ۔ یہ اور بات تھی کہ وہ لوگوں کے زور دینے پر آئی، سی، ایس ۔ پی، سی، ایس ۔ اور نہ جانے کتنے "ایسوں" کے امتحان میں شریک ہوا ۔ مگر شکر ہے کہ وہ فیل ہو ہو گیا ۔ ورنہ قوم کا اور اد بی خدمت جس کے لئے وہ بنایا گیا تھا کس طرح کر سکتا تھا؟ اب تو وہ صرف ایک پرائیویٹ اسکول میں عیوضی پوری کر رہا تھا ۔ چونکہ دو سال سے وہ برابر عیوضی پوری کر رہا تھا ۔ اس لئے اُس کی ترقی کا کوئی سوال ہی نہ تھا ۔ پر خواب کہیں پیسوں سے تھوڑی دیکھے جاتے ہیں ۔ پیسہ کوئی دوربین تو ہے نہیں کہ آنکھ سے لگایا اور دور دور کی چیزیں دکھائی دینے لگیں ۔ خواب دیکھنا تو مفت کا معاملہ ہے ۔ وہ مزے سے چارپائی پر لیٹ جاتا ۔ کہنی کا مثلث بنا کر آنکھوں پر کھڑا کر لیتا ۔ اُس کا ایک پیر خود بخود دوسرے پیر پر چڑھ جاتا اور یہ آسن اُسے سپنوں کی نگری میں پہونچا دیتا ۔ وہ کتنی باتیں دیکھا کرتا! اُس کا پرانا پلنگ اور گھٹا ہوا کمرہ جادو کے زور سے اُڑ جاتے اور وہ اپنے کو ایک عجیب و غریب جنگل میں میں پاتا ۔ جہاں ایک ضعیف سادھو بھگوان سے دھیان لگائے ہوتا ۔ یقین کیجئے سادھو کبھی اکیلے نہیں ہوتے ۔ اُن کے ایک لڑکی ضرور ہوتی ہے جس کی ماں نہیں ہوتی ۔ اگر ماں ہو تو پھر مزہ ہی کیا ۔ کمبخت سانپ کی طرح اس کے چاروں طرف کنڈلی مارے بیٹھی رہے گی ۔ اور پھر سادھو اور اُس کی لڑکی کا ہونا بالکل فضول ہے خواہ جنگل کتنا ہی حسین اور سُریلا کیوں نہ ہو ۔ ہاں اور یہ لازمی ہے کہ وہ لڑکی حسین ہو ۔ بے انتہا حسین ۔ بھلا سادھو کی لڑکی جنگل میں دریا کنارے کنول توڑ رہی ہو اور سیاہ، کھُتری اور چپٹی ہو تو بے اختیار یہی جی چاہے گا کہ چڑیل کو پانی میں ڈبو دو ۔ خیر تو اُس کے جنگل کے سادھو کی بھی حسین لڑکی ہوتی ۔ اب یا تو وہ گھوڑے پر سے گر پڑتا اور وہ لڑکی اس کا سر زانو پر رکھکر ہوش میں لاتی یا پھر وہ پیاسا ہوتا اور کٹی میں جاتا اور سادھو اپنی حسین منورما، آشا، یا روپا، جو کچھ بھی ہوتی اُسے پکارتا اور وہ بجلیاں گراتی، آنچل کے شعبدے دکھاتی آتی اور

لٹیا یا گلاس میں تازہ بکریوں کا دودھ دُوہ کر لاتی۔ شربانا اس کے لئے اشد ضروری ہوتا اور اُس کے جسم میں بجلی کوندنے کو اس کی پتلی اُنگلیاں شرطیہ طور پر چھو جاتیں اور جب یہ معاملہ ہو تو انجام معلوم ہی ہے۔ وہ دودھ پی کر تازہ ہو جاتا۔ سادھو کی یا تو ٹانگ ٹوٹی ہوتی یا اندھا ہوتا۔ یا اور کوئی بات ہوتی اور وہ دونوں اکیلے سارا سارا دن ندی پر کھیلتے۔ وہ اس وقت بالکل یہ بھول جاتا کہ اتنے دن اسکول میں حاضری کون کرے گا۔ اور لڑکوں کو اگر معلوم پڑ جائے کہ "ماٹ صاحب" ندی کنارے راس رچانے جاتے ہیں تو پھر تو وہ اسے جیتا نگل لیں۔ اور جو ذرا بہت ہیڈ ماسٹر کے داب سے پڑھ لیتے ہیں وہ بھی بند کر دیں اور لڑکوں کا خیال آتے ہی کیسا بھی مست کن خواب ہو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتا۔ وہ لڑکوں کو کوستا۔ کاش اُن سب کی مائیں بانجھ ہوتیں۔ یا بچپن میں بیوہ ہو جاتیں۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لوگ بیواؤں کی شادی پر کیوں مُصر ہیں۔ اگر چند مشینیں اتنی تیزی سے کام نہ کرتیں تو آج کو ایک ایک کلاس میں تین تین سیکشن نہ ہوتے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر دُنیا میں اتنے ننگے بھوکے کیوں ہوں کہ سڑک پر چلو تو کندھے سُوج جائیں۔ ریل میں سوار ہو تو اکڑوں سوؤ۔ سینما میں جاؤ سانس نہ لی جائے۔

مگر ابھی تو کافی وقت ہوتا اور وہ کروٹ بدل کر پھر اسی دنیا میں ڈوب جاتا۔ لیکن کروٹ کے ساتھ ساتھ اسکی دُنیا بھی کروٹ لیتی۔ سامنے لٹکی ہوئی تصویر پر اُسکی نگاہ جم جاتی۔ یہ تصویر ٹیگور کی تھی، جو اُس کی بہن نے شادی ہونے سے پہلے لگائی تھی اور اسباس کے جانے کے بعد بھی ویسی ہی لٹکی ہوئی تھی۔ وہ نویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ ٹیگور کی نظمیں پڑھ پڑھ کر وہ بالکل اُس پر دیوانی ہو گئی تھی۔ وہ کس طرح اُن کی پوجا کیا کرتی تھی۔ اُس نے اُنہیں اپنا دیوتا مان رکھا تھا۔ اوہ۔ کاش وہ بھی کوئی شاعر یا مضمون نگار ہوتا تب؟ تب تو ضرور کوئی اسکی بھی اس طرح پوجا کرتا۔ وہ تھوڑی دیر میں سچ مچ خود کو ٹیگور یا اور کوئی بڑا اور مشہور شاعر سمجھنے لگتا۔ ہر لڑکی کے کمرے میں اُسے اپنی تصویر لٹکتی نظر آتی جس میں ڈاڑھی

نہ ہوتی - مگر آنکھیں اُس کی اپنی آنکھوں سے آٹھ گُنی خوبصورت اور بڑی ہوتیں - خمدار سیاہ کاکلیں - مرمریں گردن پر رقص کرتیں - اور پیشانی ہیرے کی طرح دمکتی - افسوس اُس کی اپنی گردن کھردری اور دُھوپ سے جلی ہوئی تھی اور قبل از وقت بال جھڑنے پر آمادہ تھے - مگر کوئی پروا نہیں ، خواب میں اِن باتوں کا جھگڑا نہیں ہوتا - بس تو ہزاروں لڑکیاں جو لازمی طور پر حسین اور جوان ہوتیں اس پر مرجاتیں - پُلندے کے پُلندے ڈاک سے خطوں کے آتے - کمرہ پھولوں کے تحفوں سے بھر جاتا - اور وہ اُن کے عشق سے تنگ آجاتا مگر اُن میں سے سب سے زیادہ حسین ، امیر ، اور جوان اُس کا کہیں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی ، وہ تو اس پر جان فدا کرتی - اور وہ کھنچتا ، وہ لپٹتی یہ بھاگتا ، وہ ندیدی بلّی کی طرح اس کے چاروں طرف گھومتی - پر وہ گیانی سادھو کی طرح اُسے دھتکارتا - وہ اسکی یاد میں تڑپتی یہ اُسے بھول جاتا - اُس کے ماں باپ ، بہن بھائی ، کُنبے رشتے والے اُسے لعنت ملامت کرتے - مگر وہ سب کچھ تج کر اُسی سے چمٹتی ......

"پران ناتھ مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دو"

"دُنیا کیا کہے گی"

"میری دُنیا تو تم ہو"

اُس کا دل پگھلتا جاتا - اوہ .... مگر عین اُسی وقت دھوبن دروازہ کوٹتی - دُھوبن ! سُنہرے مکھڑے والی لچکتی ہوئی - ...... وہ اپنے کو گھاٹ پر پاتا - چھوا چھور نکیلی دُھوبن چندریاں دھوتی ہوتی ..... اُس کی کنول جیسی آنکھیں پریم ساگر میں ڈوبتیں - اس کا دل کُلبلانے لگتا - جیسے کوئی آساوری گا رہا ہو اور گاتے گاتے کومل سُر لگا دے -

اور یکایک دھوبن کے گھر والوں سے لڑنے کی گرج سنائی دیتی ہے - بجائے سُریلی دُھوبن کے اُس کی بھینگی ساس ، جب بہت سے کپڑے کھو جاتے ہیں تو ہمیشہ ہی بھینگی ساس کپڑے لیکر آتی ہے تاکہ کوئی اُس سے کپڑوں کے کھونے پر باز پُرس کرے تو خوب

دنگا مچائے۔ دام کاٹنے نہ دے۔ بلکہ اتنا لڑے کہ سارا گھر پست ہو کر پاگل ہو جائے اُس نے آنکھیں بھینچ لیں اور لرز اٹھا کہ اب دو چار گھنٹے دھوبن کے معرکہ میں گئے۔

جب وہ شاعر پرست لڑکیوں سے گھبرا اُٹھتا تو اُسے ارمان ہوتا کہ کاش کسی کا کوئی حادثہ ہی ہو یا موٹر لڑے۔ یا طوفان آئے اندھیری رات میں وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر کسی امیر اور حسین لڑکی کو موت کے پنجوں سے بچائے۔ لڑکی تو خیر شرما کر آنچل ڈھلکا لے مگر امیر آدمی (جس کے کوئی دوسری اولاد نہ ہونا چاہیئے) اُسے موٹر میں لیجائے اور تخیّل میں وہ موٹر کی سرسراہٹ سنتا اور پہلو میں حسین لڑکی کا کانپنا محسوس کرتا، ایک عالیشان کوٹھی کے رئیسانہ ڈرائنگ روم میں وہ اُس کا شکریہ ادا کر کے چھوڑ کر چلا جاتا۔ پر وہ لڑکی کو چھوڑ جاتا اور خود فوراً یا تو ضروری کام میں لگ جاتا یا فوراً بیمار پڑ جاتا۔

اب وہ حسین لڑکی اُسے پُر تکلف چائے پیش کرتی اور شرمائی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھتی تو اس کی ہستی کے تار جھنجھنا اُٹھتے۔ سادھو کی لڑکی اُس وقت اُسے اسقدر بھدّی لگتی کہ کیا بتایئے۔ اسے اپنے اسقدر فرسودہ خیال ہونے کا یقین ہی نہ آتا کہ وہ ایک جنگلی لڑکی سے محبت کر سکتا تھا۔ سادھو والی لڑکی اُسے پھوہڑ اور سڑ بلّی سی معلوم ہوئی۔ دودھ لُٹیا میں لیئے چلی آرہی ہے۔ پیاس لگی ہو تو چائے پلانی چاہیئے۔ نہ کہ نکھرا بجھلا ندا بکریوں کا دودھ کہ اُبکائی آجائے۔ اور لُٹیا سے کوئی دودھ پیئے تو کیسے پیئے؟۔ سارا پا چھوں میں سے بہ جاتا ہے۔ چائے سے اس کا دماغ کھُل گیا۔

اب محبّت نہ ہوتی تو امیر آدمی کی لڑکی ہی کیوں پیدا ہوتی۔ لہٰذا وہ تو ہوئی ہی، اب دو باتیں ہوتیں۔ یا تو امیر آدمی فوراً اُسے گھر داماد بنا لیتا اور دونوں ہنسی خوشی رہنے سہنے لگتے۔ یا اگر کوئی جنّاتی بڈھا ہوتا تو اودھم مچاتا..... بڈھے کے اودھم مچانے کے خیال سے ہی اُس کے خواب پھسلنا شروع ہو جاتے۔ اور سب تتّر بتّر ہو جاتے۔ اُسے یاد آجاتا کہ شادی وادی اُسکی کچھ نہیں ہو رہی ہے۔ بلکہ شام کو اُسے ڈبل ڈیوٹی بجانے پھر اسکول جانا ہے۔

وہ امتحان دیتے ہوئے لڑکوں کی قطاریں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر گھڑی کے پینڈلم کی طرح گھومتا۔ لڑکے سر جھکائے کاغذ گودنے میں تندہی سے جٹے ہوئے۔ گویا بڑا اہم کام کر رہے ہیں۔ مگر وہ خوب جانتا ہے کہ امتحان دینے کے بعد یہ لڑکے بھی اسی طرح گھڑی کے زنگیائے پُرزوں کی طرح ایڑیاں رگڑیں گے۔ کاغذ کتنا مہنگا ہوتا جا رہا ہے۔ اگر سوچ سمجھ کر کام لیا جائے تو...... خیر اسمیں اس کا کیا دخل تھا؟۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ پھر اونگھ جاتا...... اُس کا دماغ سویا کرتا۔ مگر ٹانگیں برابر آگے پیچھے کھسکتی رہتیں۔ گھر پر جو بُڈھے امیرے وہ لڑائی کو ادھ بیچ میں چھوڑ آیا تھا اُسے پھر جوڑ توڑ کر شروع کرتا۔ لیکن اس کنجوس خبیث سے لڑنا اُسے قطعی نہ بھاتا اور وہ فوراً ہی رُخ بدل کر کوئی دوسری ترکیب سوچنے لگتا۔ اِس مرتبہ اس کے خوابوں کی رانی کبھی تو ریل کے کپارٹمنٹ میں سب مسافروں کے چلے جانے کے بعد مُسکرا مُسکرا کر ایک نیا قصہ شروع کر دیتی۔ یا سڑک کے نکڑ پر سُنسان گلی میں اُس کی سائیکل سے ٹکرا جاتی۔ یا اپنے شاندار موٹر سے اُسے کچل کر گھر اُٹھالے جاتی۔ یا کبھی ایسا بھی ہوتا وہ بیہوش ہو کر اُسکی آغوش میں آن پڑتی اور پھر؟...... پھر وہی بات!۔

وہ جہاں جاتا...... جدھر دیکھتا ایک نہ ایک لڑکی ضرور اُس کے کام میں ٹانگ اَڑا دیتی۔ جھلا اٹھتا الجھن جاتا۔ آخر یہ ذلیل کمینی، بیوقوف ہستی، شیطان کی طرح آگے پیچھے کیوں لگی ہوئی تھی۔ دُنیا کے ہر معاملے میں گھُسی پڑتی ہے اور خواہ مخواہ اودھم مچاتی ہے کمبخت کو چار دیواری میں بند کردو، بیڑیاں ڈالو۔ پر چھلاوے کی طرح ہر جگہ موجود...... اوہ! مگر کہاں؟ موجود تو تھیں مگر اس سے کتنی دور! ماں نے کتنی ہی لڑکیاں ڈھونڈیں پر سب چڑیلیں، بھونڈی، چپٹی، نکٹی۔ خاندان بھر میں ایک بھی ڈھنگ کی نہ تھی۔ ہندوستان میں سیاہ رنگت نے تو اور بھی لٹیا ڈبو دی۔ اُدھر کے ملکوں میں بلا سے رنگت تو ہے۔ یہ نہیں کہ کالی کالی چھپکلیاں سی۔ دیکھو تو دل ٹوٹ جائے۔ اُس کے خیالات فوراً بدل جاتے

اور اُسے سادھو کی لڑکی کے چہرے پر گہرے گہرے داغ دکھائی دینے لگتے ۔ وہ امتحان دیتے ہوئے لڑکوں کی شکلیں گھورتا ۔ اندازاً سب کی بہنیں اُسے بھونڈی نظر آتیں کمبخت کیا بُری شکلوں کے تھے ۔ بنواری کی ناک پر تو جی چاہتا گھونسا مار دے ۔ خصوصاً جب وہ جومیٹری سمجھاتے وقت اپنا پورا دھیان کھڑکی سے باہر خوش مذاق کتوں کیطرف لگا دیتا ۔ دہنیو کمبخت بھینگا ، بھنویں تکونی ـــــــ دانت سڑے ہوئے ۔ سرُوپ کے تو خیال ہی سے وہ جل اُٹھتا ۔ لوگ کہتے ہیں بچوں کو پیار سے پڑھاؤ ۔ چاہے جی چاہتا ہو کہ سب کو زندہ جلا دیں ۔ مگر پیار کروایا جا رہا ہے ۔ خوب ! ہیتی ہو جانو ۔

کونے میں بیٹھی ہوئی مرہٹی لڑکی کو دیکھ کر وہ اور بھی تنگ ہوتا ۔ اُس کے نخرے ہی نرالے ۔ زیادہ سے زیادہ بارہ چودہ برس کی ۔ پر وہ کلاس میں ایسی رکھی جاتی تھی ۔ جیسے روئی کا پھویا ۔ الگ ایک کونے میں اینٹھی ہوئی ۔ غرور سے بیٹھ اکڑ لئے ڈٹی رہتی ۔ یہ فتنی نہ جانے کتنے دل چلوں کو ہیڈ ماسٹر صاحب سے ٹھکوا چکی تھی ۔ ذرا کوئی بولا اور وہ انڈوں پر بیٹھی مرغی کی طرح کُڑکُڑائی ۔ خود وہ ماسٹر ہو کر اس سے ڈرتا تھا ۔ اور ویسے اُس میں دھرا کیا تھا ۔ ذرا سی چھوکری کون مُنہ لگے ۔ مگر جب بھی اس کی طرف دیکھو معلوم ہوتا کہہ رہی ہے "کہہ دوں ہیڈ ماسٹر صاحب سے ؟" کبھی وہ اسکول میں کام کر کے نہ لاتی تو کیا مجال جو کوئی اُس سے پوچھ سکے کہ تمہارے مُنہ میں کتنے دانت ہیں ! ۔ وہ فخریہ بھول جانے کا عذر کر کے صاف بچ جاتی ۔ اُس کا دل چاہتا ایک کوڑا لیکر مُردار کو اتنا مارے کہ بیہوش کر دے ۔ اور جو کچھ بولے تو مُرغا بنا کر سب سے موٹے لڑکے کو اُس کی پیٹھ پر چڑھا دے ۔

یہ عورت ..... عورت ..... عورت منحوس ، چڑیل ، دیوی گیتا ..... دل کی رانی .....ڈائن ..... شکر ہے کہ چھٹی ہو گئی اور خواب ختم ہوا ۔

آخر وہ شادی کیوں نہیں کر لیتا ؟ ۔ نرا بے وقوف ! ۔ ماں کہتی ہے ۔ "کوئی اچھی لڑکی نہیں ملتی ۔"

لڑکی اچھی بُری؟ لڑکی لڑکی ہوتی ہے۔ نہ کہ اچھی بُری اور اُسے ساری لڑکیاں ایک ہی جیسی معلوم ہوتیں۔ جیسے پختہ اینٹیں .... سب کی سب چالاک، کاہل، مٹھوس، اترانے والی۔ لڑکیاں نہیں ہلتیں؟ اور یہ جو بھر بھر لاری اسکولوں کو جاتی ہیں وہ کیا بکریاں ہیں؟ اسکولوں کی لاری میں فوراً ایک نئی جاذبیت پیدا ہوجاتی ... چھٹی کلاس میں جب سے اُسے مہترانی کی بہو کی کمر لچکتی نظر آئی تھی اس کے لئے لاری ایک اُڑن کھٹولا بن گئی تھی۔ جس پر پریاں لد لد کر شہر کے گناہگاروں کا دل للچانے، گلی کوچوں میں مٹرگشت اڑاتی تھیں۔ اب بھی جب وہ لاری کا ہارن سنتا تو سوئے ہوئے دل کے سارے بھوت پریت جاگ اُٹھتے۔ جلدی جلدی پیر مار کر لاری کے پاس پہونچ کر اپنی بھوکی آنکھیں لڑکیوں کے جسموں پر چبھو دیتا..... مگر.....

دُور سے لاری میں لڑکیاں ہی لڑکیاں بھری ہوئی بالکل حوریں معلوم ہوتیں پر جب قریب آکر غور سے دیکھتا تو مُرجھائے ہوئے کالے، کھُترے، چوکھونٹے، تکونے چہرے رنگ برنگے چیتھڑوں میں اُلجھے ہوئے ایسے معلوم ہوتے جیسے خزاں آنے پر چند ڈھیٹ کیتھ کے پھل ڈالیوں پر لٹکے رہ جاتے ہیں۔ وہ آپس میں کچ کچ مرغیوں کی طرح لڑتیں اور کوئی بھی تو اُن میں سے اپنا حسین معصوم بھولا چہرہ مسکرا کر باہر نہ نکالتی۔ کسی کی بھی تو نرگس جیسی آنکھیں نہ ہوتیں۔ چمیلی کی کلیوں کی طرح نازک اور پتلی اُنگلیوں کی بجائے گھسے ہوئے چپٹے ناخونوں والی ٹھنگنی انگلیاں۔ سیہی کے کانٹوں کی طرح جھولتی ہوئی لٹیں میلی ناکیں اور اُلجھی ہوئی چُٹیاں، اُس کا سارا رومان ٹوٹ کر چُور چُور ہوجاتا۔ وہ پکّا ارادہ کر لیتا کہ اس غلیظ جنس سے اب وہ کوئی واسطہ نہیں رکھے گا۔ بدبخت..... اسکے خیال تیرنے لگتے..... جب وہ نویں میں پڑھتا تھا تو آٹھویں میں کیسا نازک نازک سا ایک لڑکا پڑھنے آیا کرتا تھا..... مگر اُس کے ساتھ اُسے چند ناگوار واقعات یاد آگئے، اور وہ بھڑک گیا۔

ٹنن ٹنن - کوئی کالج کی لڑکی سائیکل اُڑاتی آرہی تھی - خواب پھر بدلے کیا عجب سائیکلیں ٹکرائیں - جیسے ستارے ٹکراتے ہیں ——— اور پھر طوفان ..... گرج اور چمک ..... بیہوش حسینہ ..... مگر ..... وہ بریک ..... بریک ..... لگا ہی نہیں - ایک ستارا کا وادیکر نکل گیا ——— ایک گرا دھم سے - گھٹنوں پر سے پیجامہ مسک گیا گھٹنے چھل گئے - دوسرے ستارے کی ساری دور موڑ پہ ہوا میں لہرائی اور گم -

کاش اُس کا بس چلتا ! اُس کا بس چلتا تو وہ بتاتا - منحوس لڑکی - بڑی علم حاصل کر رہی ہیں - کچھ نہیں ، کچھ پڑھنے وڑھنے کی ضرورت نہیں - جنگلی ..... ان سے سادھو کی لڑکی ہی ہزار بلکہ کروڑ درجے اچھی تھی - دودھ تازہ چمکتی ہوئی پیتل کی لٹیا میں باچھوں میں بہ رہا ہے - اِس سے تو وہ مٹرک کوٹنے والی ہی اچھی گو اس کی کھال جھلس کر سائیکل کی گدی سے ملنے لگی ہے - اور پنڈلیاں پھوڑوں سے لدی ہوئی ہیں - اور دومنٹ ساتھ بیٹھ جاؤ تو جوئیں بلبلانے لگیں - مگر ذرا آنکھ جھپکاؤ مسکراہٹ کی بجلیاں تیار -

وہ سائیکل والی لڑکی کیلئے ننھے ننھے کوسنے تراشتا ہوا چلتا - ٹانگ ٹوٹ جائے چھوڑ کر چلا جائے کوئی اُسے - کاش اُسکے ناجائز بچہ ہو اور کالج سے نکالی جائے - وہ عورتوں کیطرح کوسنے لگتا - کالج میں پڑھنے والیوں کو ہی کوسنے دیتے ہیں -

اور خواب اور خواب ! کالے کالے بھوتوں کی طرح دانت نکال کر تھرکتے -

حادثے جنگل - سادھو اور اسکی لڑکی ..... ڈرائنگ روم - مٹرک ، لاری ، شادی بیاہ ، سب گڈمڈ ہو کر ایک دوسرے سے اُلجھ جاتے اور سب کے سب سیاہ بادلوں کی طرح اسکی ہستی پر اُمنڈ کر گرجنے لگتے - اور پھر ———

لوگ کہتے ہیں اُسے "دماغی بخار" کی شکایت ہے —— مَیں سوچتی ہوں شاید یہ بھی اُس کا ایک خواب ہے۔
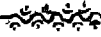
# جنازے

میرا سر گھوم رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کاش ہٹلر آ جائے اور اپنے آتشیں گولوں سے اس نامراد زمین کا کلیجہ پھاڑ دے جس میں ناپاک انسان کی ہستی بھسم ہو جائے۔ ساری دُنیا جیسے مجھے ہی چھیڑنے پر تُل گئی ہے۔ میں جو پودا لگاؤں مجال ہے کہ اُسے مرغیوں کے بیدرد پنجے کُریدنے سے چھوڑ دیں۔ میں جو پھُول چنوں بھلا کیوں نہ وہ میری سہیلیوں کو بھائے۔ اور وہ کیوں نہ اُسے اپنے جوڑے کی زینت بنا لیں غرض میرے ہر فعل اور قول سے دُنیا کو بیر ہو گیا ہے۔ اور میری دُنیا بھی کتنی ہے۔ یہی چند بھُولے بھٹکے دوست۔ دو چار سیکنڈ ہینڈ عاشق مزاج اور کچھ بھونڈے، لڑاکا، اور فیشن پر مرنے والی سہیلیاں۔ یہ بھی کوئی دُنیا ہے؟ بالکل تھکی ہوئی دُنیا۔ میرے تخیلات سے کتنی نیچی اور دُور۔ اور اب تو اس دُنیا میں اور بھی دُھول اُڑنے لگی۔ معلوم ہوتا ہے میں قبل از وقت پیدا ہو گئی ہوں۔ تغلق جسے دُنیا دیوانہ کہتی تھی، وہ بھی اپنے وقت سے پہلے آیا تو حواس باختہ ہو گیا، پھر میں کیا چیز ہوں؛ لیکن ایک زمانہ ہوگا جب دُنیا میری ہم خیال ہو جائے گی۔ لوگ میری سنیں گے۔ اور کشور؛ کشور کے واقعے نے تو مجھے بالکل نیم مُردہ کر دیا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ میری چیخ پکار رایہ پھڑکتا ہوا دل، جس میں انسانی ہمدردی اور اخوت کا سمندر لہریں مار رہا ہے۔ جس کے خواب ملک کی بہتری کے نذر ہو چکے ہیں جس کے جذبات مذہب

اور انسانیت میں غرق ہیں۔ یہ سب کچھ بیکار بالکل بیکار۔ بیل گاڑی کی چوں چوں۔ اور مریل گھوڑے کی ٹاپوں میں بھی تو اس سے زیادہ اثر ہے!۔

"یہ بھی کوئی دُنیا ہے، یہ بھی کوئی دُنیا ہے" میں کرسی پر جھوم رہی تھی۔

"کس کی دُنیا؟ میری؟" راحت اندر آ کر تخت پر بیٹھ گئی۔

راحت ــــــ؟ آپ نے چند موم کی پتلیوں کو تو دیکھا ہو گا۔ ننھّی مُنّی کھیل کود کی شوقین۔ جن کا مقصدِ زندگی کھیلنا ہے۔ گڑیوں سے کھیلنا۔ کتابوں سے کھیلنا۔ اماں ابّا سے کھیلنا۔ اور پھر عاشقوں کی پوری کی پوری ٹیم سے کبڈّی کھیلنا۔ ابھی میرے بدنصیب بھائی کے ساتھ ٹینس کھیل کر آ رہی تھی۔

"تمہاری دُنیا؟ راحت تمہاری دُنیا تو ٹینس کے کورٹ پر ہے" میں نے تلخی سے کہا۔

"کون .... میری؟ تمہارا مطلب ہے ضمیر؟ توبہ کرو۔ وہ تو تمہارا بھائی ہے پر ہے چغد معاف کرنا۔ اللہ قسم ایسے ہاتھ چلاتا ہے جیسے ٹینس کے بجائے فٹ بال کھیل رہا ہے۔ اور پھر مزہ یہ ہے کہ اگر جناب کے ساتھ نہ کھیلو تو .... یہ کہ .... بس"

یہ میرے بھائی صاحب کی شان میں میرے منہ پر فرمایا جا رہا تھا۔ اگر میں بھی شہنشاہ اکبر کی طرح طاقتور ہوتی تو اس بے ایمان چھوکری کو انارکلی کی طرح دیوار میں زندہ چُنوا دیتی۔ یہ پُرفن لڑکیاں بیوقوف لڑکوں کو خون کے آنسو رُلواتی ہیں اور موت کی ہنسی ہنسواتی ہیں اور پھر چپٹ کہیں اور کسی کی ہو رہتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ضمیر اُلّو ہے اور رہے گا۔ کیا جناب کی تھرڈ کلاس پسند ہے۔ وہ لڑکی جس میں نام کو عقل نہیں۔ جس میں نہ قوم کی ترقی کا جوش، نہ قربانی کا جذبہ، نہ ملک کا پیار، جو بی۔ اے کرنے کے بعد بھی نہ مرد کی اصلی فطرت کو سمجھی اور نہ عورت کے جذبات سے واقف۔

"مگر آپ کو اُس کی اتنی دلداری کیوں منظور ہے۔ آپ دو مردوں سے کھیلیں"

دیکھیں کون آپ کو روک سکتا ہے۔"

"بھئی واہ، روکے گا کون - پر اچھا نہیں لگتا - وہ ..... مجھے بچارے پر رحم آتا ہے - دوسرے ....."

"خوب رحم آتا ہے - اُسے جیسے .... جیسے دوسری کوئی نصیب نہ ہو گی"

میرا خون کھول گیا -

"اے ہو ملے گی کیوں نہیں .... یہ میں کب کہتی ہوں ..... مل جائے گی - مل ہی جائے گی" راحت ہکلانے لگی -

"مل ہی کیا جائیگی - اُسے کمی نہیں - یہ تو .... وہ بے وقوف ہے ــــ"

"ہاں ــــ یہ بات ہے جبھی تو میں کہتی ہوں" راحت خوشی سے چہکی -

"جبھی تو کیا ..... ؟" میں نے جل کر پوچھا -

"اے بھئی یہی کہ .... بھئی مجھے نہیں - تمہیں معلوم ہے کہ مجھ میں تمہاری جیسی عقل نہیں اور نہ مجھ سے بحث کی جائے - تمہیں یاد ہے کہ میں تو کوئی .... بالکل .... بھئی کبھی بحث کر ہی نہ سکی - یہی تو بات ہے کہ ضمیر ....."

"ہاں کیا ضمیر ؟" میں نے اس کی شکست سے خوش ہو کہا -

"یہی .... یہ مجھے ضمیر پر .... یہی کہ بس خیال آتا ہے کہ وہ بچارا ــــ"

"اور ہو تم کتنے فخر سے اُسے بچارا کہتی ہو" میرا منہ کڑوا ہو گیا -

"آج تو تم بے طرح بگڑ رہی ہو کیا ہوا ــــ کیا سعید نے ڈانٹا - ابھی سے اینٹھتا ہے"

سعید کے نام سے میرے بدن میں پتنگے لگنے لگتے ہیں - آپ ایک اور راحت جیسی روح رکھنے والے انسان ہیں - آپ نے کمال فرمایا تھا کہ ایک دفعہ مجھ پہ عنایت کی - کمال - میرے جواب سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُن کا کیا حال ہوا ہوگا

پہلے تو ذرا متعجب ہوئے۔ پھر خوب متعجب ہوئے۔ اور پھر اور زیادہ ہوئے۔ بعد میں سنا تھا اپنی غلطی پر بہت شرمندہ ہوئے۔ ضمیر سے بولے کہ "میں انہیں غلط سمجھا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید.... مجھے اُن پر ترس آیا تھا" خدا جانے یہ انہیں مجھ پر ترس کھانے کا کیا حق تھا۔ اور کیسا ترس؟۔ یہ مجھ پر آج تک واضح نہیں ہوا۔

لیجئے اتنا لمبا قصہ سعید کا ہی ہو گیا۔ وہ تو میں نے کہا نا کہ میں تو بات بھی کروں تو اُس کو بھی تو گڑبڑا دیتے ہیں یہ دینا والے!۔

"ہونہہ سعید کی ہمت۔ وہ ہیں کیا چیز؟ اگر سعید ذرا بھی کچھ ہوتے تو مجھے یہ الفاظ کیوں استعمال کرنا پڑتے؟"

"اتنا چوڑا، چکلا اور اونچا انسان اور تم "کچھ" لئے پھرتی ہو"

"اِنسان کی بڑائی چوڑے چکلے ہونے سے نہیں ہوتی۔ عقل...."

"اُونہہ! آخر عقلمند ہونے کی ایسی کیا مار ہے اور عقلمند میاں میں ایسے کیا لعل جڑے ہوتے ہیں۔ بیکار میں رعب گانٹھتا ہے۔ اور پھر تمہیں کہتی ہو کہ مردوں کی حکومت نہ سہنی چاہیئے۔ میرے خیال میں ضمیر.... جبھی نہ میاں ضرورت سے زیادہ عقلمند ہو گا نہ ہم کو دبایا جائیگا"

"تم میں کاش ذرا سوچنے کی بھی ہمت ہوتی۔ بحث کرنے لگتی ہو۔ مگر.... خیر، یہ میرا سوقت مسعود کا کیا ذکر۔ میں تو کشور کو کہہ رہی ہوں"

"کون کشور؟"

"روفی والی"

"کون روفی؟"

"اللہ! اتنا بننا!"

"اونہہ تو گویا میں تمہاری کشوروں اور روفیوں کے رجسٹر لئے اُن کی مثنوی

لکھا کرتی ہوں۔ تمہارا مطلب کشور سے ہے —— وہ روتی کشور ؟"

"جی وہی۔ روئے نہ تو غریب کیا کرے۔ ہم عورتیں تو رونے ہی کے لئے پیدا ہوتی ہیں" یہ چند آخری الفاظ میں نے خود سے کہے اور ٹھنڈا سانس روک سکی

"ہاں رونے سے آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی ہے۔ سارا گرد و غبار..... "

"اور تمہارا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ جاؤ راحت میں اسوقت تمہار بدمذاقی سہنے کے لائق نہیں۔ جاؤ ٹینس کھیلو"

"ہوں۔ ٹینس کھیلو، جیسے تمہارے بھیا کو آتی بھی بڑی ٹینس ہے —— میں تو آئی کہ چلو بھئی ہو آئیں ذرا۔ اور آپ ہیں کہ..... " راحت بُرا مان گئی۔

"تو تم سمجھتی ہو میں بڑی خوش بیٹھی ہوں کہ تم مجھے آکر جلاؤ۔ ایک تو تم بار بار ضمیر کو بُرا بھلا کہے جا رہی ہو۔ آج میں ویسے ہی پریشان ہوں کشور سے ملی تھی۔ تمہیں کیوں یاد ہو گی کشور؟ تم کوئی اس کی تھوڑی بہت ہی لکھ رہی ہو"

"ہاں ہاں پھر کیا ہوا"

"اس کی شادی ہو رہی ہے" میں نے اٹھتے ہوئے طوفان کو دبایا۔ کئی دن سے دبا رہی تھی۔

"اچھا۔ کب ؟"

راحت کو کشور کے دکھ سے کیسے نہ پہونچے گا تو کسے پہونچے گا ؟ کشور ٹھہری میری دوست اور میں ضمیر کی بہن اور ضمیر، راحت کے زبردستی کے عاشق۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ آج میں ہوں اور ضمیر۔ سور کہیں کا !

"کیا اُسی مرگھلے سے تو نہیں ہو رہی ہے" راحت ڈر گئی۔

یہ مرگھلا روتی کو کہا جاتا تھا۔ اور کیوں ؟ وہ اس لئے کہ راحت اس کے اشعار سے نفرت کرتی تھی۔ کیوں ؟ کیونکہ بس تھی۔ فرماتی تھیں "بہت ڈھیلے

ڈھیلے شعر کہتا ہے۔" اب شعروں میں نہ جانے ڈھیلے اور تنگ شعر کیسے ہوتے ہیں۔

"تم اُسے مرگھلا کہتی ہو۔ لیکن کشور کے دل سے پوچھو۔"

"کشور تو سدا کی سڑن ہے۔"

"بس راحت زیادہ بنومت۔ تم سے زیادہ....."

"اے ہے معاف کرو، باز آئی میں تمہاری کشور کے قصّے سے، ختم بھی کرو۔"
راحت مُنہ بنا کر ٹانگیں سکیڑ کر لیٹ گئی۔

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ مرجائے گی۔ مگر روؔفی کے سوا کسی سے شادی نہ کریگی۔
اور اماں کہتی ہیں کہ میں تو شوکت سے کروں گی۔"

"اے ہے! بڑھیا شادی کر رہی ہے۔" راحت چونک کر اُٹھی۔" تمہیں
خدا کی قسم۔"

"اوہو، اوہو۔ جیسے کچھ اتر انے میں بھی مزہ ہے۔ کشور کی شادی کا ذکر
ہے اور بننے لگیں۔"

"ارے ... میں سمجھی... خیر... پھر؟"

"کشور کہتی ہے کہ زہر کھاؤں گی۔ مگر روؔفی کے سوا....." باوجود ضبط کے
میرا گلا گھُٹ گیا۔

"ارے..... مگر کونسا زہر کھائے گی؟ میرے خیال میں سائنا ئیڈ ٹھیک رہیگا۔"

"راحت۔ پتھر کا کلیجہ اور لوہے کا دل اسی کو کہتے ہیں۔ ساتھ کھیلے، ساتھ
پڑھے، ساتھ اسکول گئے۔ اور پھر کالج۔ مگر اس بے حس گوشت کے لوتھڑے کو۔"
اُفوہ۔ میرا خون پھر کھول گیا۔

"چپ رہو بے رحم! کاش بجائے انسان کے خدا تمہیں ایک چٹان بناتا۔
جس پر۔ جس پر..... مجھے کوئی پُر معنی لفظ ہی نہ ملا۔" تمہاری بلے رتی۔ دھتکار

دکھ نہ پہونچاتی۔ ذرا سوچو بے قصور کشور نے تمہارے ساتھ کیا بدی کی ہے؟ اس نے تمہیں کیا دکھ پہنچایا۔ وہ جو ایک معصوم چڑیا سے بھی معصوم ہے۔ وہ جس نے سر جھکا کر دنیا کے دکھ سہہ لیے، اور سہہ رہی ہے۔ وہ جسے اس کی ظالم ماں دولت اور شہرت کی بھینٹ چڑھا رہی ہے۔ جو سر لٹکائے راضی برضا قرباں گاہ کی طرف جا رہی ہے۔" میری زبان کے ساتھ ساتھ عمدہ عمدہ جملے تیزی سے چل رہے تھے۔ "جس نے قصائی کے سامنے گردن ڈال دی ہے۔ اور خاموش اسکی چھری کی دھار کو دیکھکر اپنا ہی خون جلا رہی ہے۔ تم بھی اسے دو باتیں کہہ لو۔ مگر دور ہو جاؤ میری آنکھوں سے۔ جاؤ راحت۔"

"اے ہے توبہ.... ماشاءاللہ تم بڑی بدمزاج ہو ــــ" راحت ڈر کر سکڑ گئی

"ایسا میں نے کیا کہدیا؟"

"تم نے کیا کہا؟ اور اوپر سے یہ بھی پوچھنے کی ہمت ہے؟ ــــ تم اس کی موت پر ہنس رہی ہو۔ اس کا خون ہو رہا ہے، تم ہنس رہی ہو۔ وہ مرغ بسمل ہو رہی ہے۔ اور تم ہنس رہی ہو ــــ اس کی لاش ــــ ہاں اس کی لاش پر تم دانت نکال رہی ہو" مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ سوائے ایک معصوم کے جنازے کے۔

"اوہ .... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اللہ کا واسطہ چپ ہو جاؤ۔ اچھی ذرا بجلی جلا دو مجھے ڈر لگ رہا ہے" راحت پیلی پڑ گئی۔

"تم سمجھتی ہو تمہارے اوپر اس کا کچھ اثر نہ ہوگا۔ تم ہنستی ہی رہو گی، اس کی موت پر ــــ مگر یاد رکھو راحت، کشور تمہیں نہیں چھوڑے گی۔ وہ مر جائے گی مگر کیا وہ تم سے سوال نہ کرے گی۔ اس کی روح ....."

"ہائے بجلی جلا دو میں ..... اچھی بہن میرا دم نکل جائیگا" راحت بزدلوں کی طرح چلائی اور جلدی سے اپنے پیر تخت کے اوپر رکھ لیے۔ گویا تخت کے نیچے سے کشور کی روح ابھی اسے اس کے پیر پکڑ کھینچ رہی تھی۔

"تم اس کو بچاؤ — بچاؤ گی۔ تم اس کی مدد کرو گی۔" میں نے ایک مسمریزم کا تماشہ کرنے والے کی طرح کہا۔

"ہاں مگر بجلی —" راحت کانپ رہی تھی۔ "ہاں .... اب ...."

"تم اس کی ماں کو مجبور کرو گی کہ وہ اس کے قتل سے باز آئے۔"

"مگر وہ ... تو ... بہن اُن کی ماں سے ڈر لگتا ہے مجھے۔" میری آواز کی نرمی سے اُس کی گئی ہوئی ہمت واپس آ گئی۔

"میں اور تم اس کی ماں کو مجبور کریں گے کہ وہ کشور کو زندہ دفن نہ کرے۔"

"ہاں تم کرنا ..... ریحانہ تم بہت بہادر ہو - تم - تم واقعی بہت زبردست ہستی ہو - تم انسانیت کا بہترین مجسمہ ہو - ریحانہ اگر ہماری قوم میں ایسی ہی چند لڑکیاں پیدا ہو جائیں تو ہم غلام کیوں رہیں - کیوں رہیں - اور اب تم بجلی جلاد میں زمین پر نہیں اُترو گی - میرا جوتہ بھی تو نہ جانے کدھر ہے؟" وہ کانپتی ہوئی آواز میں ایک بھٹکے ہوئے راستہ سے واپس لوٹ رہی تھی۔

"ہم اُس سے لڑیں گے، اور یہ قربانی نہ ہونے دینگے۔" میں نے اپنے آپ کو ایک طیارے پر سے بم گراتے محسوس کیا جن کے شعلے شوکت کو اور کشور کی ماں کو نگل رہے تھے۔

"مگر ... وہ کشور خود جو اپنی ماں سے لڑے نا - ایسی ننھی ہے کیا .... ؟"

"وہ خود لڑے؟" مجھے پھر جوش آیا۔ "وہ پڑھی لکھی ہے تو کیا ہے - راحت وہ مشرقی عورت ہے، وہ بے شرمی نہیں لا سکتی - وہ کہہ چکی ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ زبان ہلائے بغیر جان دیدے گی - تم جانتی ہو وہ سدا کی کمزور دل ہے۔"

"تو بہن میں کونسی پہلوان ہوں۔" راحت اور کونے میں دبک گئی۔

"تم ہو یا نہ ہو مگر میں کروں گی - میں خود کرونگی - راحت اب تک یہ نہیں - بیرحم ہی

سمجھتی تھی۔ اب معلوم ہوا کہ تم بزدل بھی ہو۔ چوہے سے ڈر جانے والی لڑکیاں! یہی تو ہماری قوم کی غلامی کی ذمہ دار ہیں"

"اوہو کوئی بھی نہیں" شکست خوردہ آواز میں کہا گیا۔

"سچ بتاؤ کشور۔۔۔ وہ میرا مطلب ہے راحت، کبھی تمہارے دل میں اپنی جنس کی ابتری کا خیال بھی آتا ہے۔ کبھی یہ بھی سوچتی ہو کہ ہم کب تک ظالم مردوں کی حکومت سہیں گے۔ کبتک وہ ہمیں اپنی لونڈیاں بنائے چہاردیواری میں قید رکھیں گے۔ کب تک یونہیں ہم دبے مار کھاتے رہیں گے۔ بتاؤ۔ بولو ——" مجھ پھر جوش سوار ہو رہا تھا۔

"سوچا کیوں نہیں.... سوچتی ہی ہوں"

"کیا سوچتی ہو۔ ذرا بتاؤ کیا سوچتی ہو؟"

"یہی کہ بھئی —— یہی سوچا کرتی ہوں کہ اب..... اصل بات تو یہ ہے کہ میں تو کچھ بھی نہیں سوچتی اور بھلا سوچوں بھی کیا..... ؟"

"یہی سوچو۔ یہی کہ کس طرح تم اپنی قوم اور ملک کے لئے قربانی کر سکتی ہو۔ کس طرح تم اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہونچا سکتی ہو۔ اٹھو راحت ابھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا۔ یہ تمہارا ٹینس بھلا قوم کو کیا بلندی پر لیجا سکتا ہے"

"بلندی؟" راحت نے خاموشی کو توڑا "ریحانہ مجھے آج یقین ہو گیا کہ واقعی تم کچھ ہو۔ تم..... میں تمہیں جھکی اور کج بحث کہا کرتی تھی۔ مگر آج.... معاف کر دو معاف کر دو مجھے۔ تم کہو میں تم.... تمہارا کہنا مانوں گی۔ بتاؤ.... میں کل ہی اپنا ریکٹ توڑ دوں گی..... کیوں توڑ دوں؟ اور میں ضمیر.... اسے بھی.... میں اب ٹینس ہی نہیں کھیلوں گی، میں اس سے شادی نہیں کرنے کی۔ میں اس سے کہدونگی کہ تم اب اس خیال کو چھوڑ دو اور تمہیں اب انگوٹھی کے ڈیزائن تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں" راحت کے لہجے میں پشیمانی اور رقّت بھری تھی۔

"مجھے تم سے یہی اُمید تھی - میں کل کشور کے پاس جاؤں گی اور اُسے یقیناً اس شکرے کے پنجے سے نجات دلاؤں گی - تم چلو گی ... کیوں چلو گی نا؟"

"ضرور، مگر تم اب بجلی جلا دو - دیکھو کس قدر اندھیرا ہے"

راحت کچھ نیم مردہ اور پریشان سی چلی گئی - برآمدے میں میں نے اُسے ضمیر کے شانے پر سر رکھے سسکیاں بھرتے دیکھا - نہ جانے وہ کیا بڑبڑا رہے تھے! "اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے" وہ نہ جانے کسے کہہ رہی تھی!

رات میرے لئے لمبی اور اندھیری تھی - مگر دُور مجھے ایک روشن ستارہ نظر آ رہا تھا - یہ میری قوت فیصلہ تھی جو میری ہمت بڑھا رہی تھی - میں کشور کو بچاؤں گی - میں ایک معصوم چڑیا کو شکرے کے خوفناک پنجوں میں سے نکال لاؤں گی - شوکت کو اپنی دولت کا گھمنڈ ہے، اپنی صورت پر ناز ہے اور تعلیم پر اکڑتا ہے - یہ سب کچھ دھرا رہ جائے گا -

سہ پہر کو راحت اور میں کشور کے یہاں پہونچ گئے - اور کشور کو دیکھکر میرا دل مسل کر رہ گیا - وہ مجھے عجیب گھبرائی اور کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی - مجھے نظر بھر کر نہ دیکھ سکتی تھی - شاید اُن آنسوؤں کو وہ بیکار چھپانے کی کوشش کر رہی تھی جو خون بنکر اُس کے رخساروں پر دمک رہے تھے - گو اُس کی آنکھیں خشک تھیں - وہ ایک شنگرفی رنگ کی ساری پہنے آئینے کے سامنے جوڑے میں پنیں لگا رہی تھی - اُسے اِس بھڑکیلے لباس میں دیکھکر میں سمجھ گئی کہ سیر ہونے کی تیاریاں ہو رہی ہیں - مگر اب میں آ گئی تھی - میں نے پیار سے اُسکی ٹھوڑی چھوئی، اور وہ ایک مردہ ہنسی میں ڈوب گئی -

"ڈرتی کیوں ہو؟" میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں -

مگر وہ بچا گئی اور ناخونوں کی پالش کی شیشیاں نکال کر اپنی ساری پر رکھکر

موزوں رنگ چھلکنے لگی۔

"جو کچھ ہونا تھا ہو گیا، میری قسمت ـــ راحت یہ ٹھیک ہے نا؟"
اُس نے راحت کو ایک شیشی دکھائی۔

"کچھ بھی نہیں ہوا۔ تم جو چاہو گی وہی ہو گا۔ کسی کی مجال نہیں کہ وہ تمہاری مرضی کے بغیر تمہیں اس بے پسند کی شادی کی آگ میں جھونکے ـــ"

وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی اور جلدی سے ناخون رنگنا شروع کر دیئے۔

"تم ڈرتی کس سے ہو" وہ اور بھی گھبرائی "میری بات سنو کشور....."

"چھوڑو ریحانہ اِن باتوں کو۔ ہاں یہ تو بتاؤ وہ تمہاری کتاب......"

"میری کتاب کو تو ڈالو چولھے میں۔ اور تم یہ بتاؤ یہ آخر تمہاری والدہ......"

"جانے بھی دو" اُس نے جلدی سے بات کاٹی "ہاں راحت وہ تمہارے ٹینس کا کیا حال ہے" اُس نے میرے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ٹینس.... ٹینس.... تم.... وہ اب.... خیر بتاؤ شوکت کہاں ہیں" راحت نے پوچھا اور کشور کا رنگ تمتما اُٹھا۔

"ہاں وہ شوکت صاحب کہاں ہیں، ذرا مجھے اُن سے بھی دو دو باتیں کرنی ہیں ـــ بے رحم انسان.... اگر انسان کہلانے کے......"

"ہٹاؤ بھی ریحانہ، جو میری قسمت میں لکھا تھا" وہ ڈر کر اور گھبرائی۔

مجھے معلوم ہو گیا کہ کشور کسی سے ڈر رہی تھی۔ گھبرا گھبرا کر وہ برابر والے کمرے کی طرف ایسے دیکھتی تھی گویا اب کوئی شیر اُس میں سے نکل کر اُسے پھاڑ کھائیگا شوکت میرا جی چاہا اُسے..... اُسے نہ جانے کیا کروں۔ ایک معصوم لڑکی کے دل میں اُس نے نہ جانے کیا دہشت بٹھا دی تھی کہ وہ اُس کے ذکر ہی سے گھبرا جاتی تھی۔ میرا ارادہ اور بھی مستقل ہو گیا، فولاد کی سی سختی آگئی۔ میں نہ صرف کشور کو ہی بچاؤں گی۔ بلکہ میرا

ہاتھ دُور دُور پہونچ کر ہزاروں بیکس لڑکیوں کو پناہ کے احاطے میں لے لیگا۔ راحت کی طرح ساری کی ساری لڑکیاں قوم کی داسیاں بن جائیں گی اور پھر ——— پھر ہندوستان آزاد ہو جائے گا ——— آزاد!۔

"کشور چھ بجنے میں صرف پانچ منٹ" قریب کے کمرہ سے ایک بھاری سی مردانہ آواز آئی۔ اور کشور سر سے پیر تک لرز گئی۔ وہ جھپٹ کر سنگھار میز کے قریب آگئی۔ میں سمجھ گئی اس سے قبل کہ وہ دراز کھولے اور سم قاتل اُس کے ہونٹوں سے گذرے میں پہونچ گئی اور اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اُسکی ساری کا پلّو گر گیا اور وہ بے طرح گھبرا گئی۔

"کشور..... اتنی بزدلی..... جانتی ہو خودکشی.....؟"

"اُونھ۔ میں تو بٹوہ نکال رہی ہوں۔ بیٹھو ریحانہ میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتی....." وہ کچھ چھپا رہی تھی مجھ سے بہت کچھ۔

"کشّو تیار ہو چکو" وہ کریہہ اور بھرّائی ہوئی آواز پھر گونجی اور کشور اور بھی پریشان ہو گئی۔ میں جانتی تھی اسوقت اُس کی کیا حالت ہو گی۔ جس طرح سُولی پر چڑھانے سے پہلے خوفناک گھڑیال بھیانک آواز میں گھنگھناتا ہے، اسی طرح یہ آواز..... پھر آئی:۔

"اور لیلا رام کے یہاں بھی تو جانا ہے" اور پھر ایک سیٹی شروع ہو گئی۔

"ذرا ٹھہرو ریحانہ میں ابھی آئی" میں نے اُسے روکنا چاہا۔ لیکن راحت نے میرا ہاتھ روک دیا۔

"ریحانہ کیا ہے۔ تم بالکل ہی بچّہ ہو..... سنو تمہیں نہیں معلوم کہ......"

میں نے اسکی بات ایک نہیں سُنی۔ پاس کے کمرے سے وہی گڑگڑاتی آواز قہقہہ لگا رہی تھی۔ دبے ہوئے گہرے قہقہے۔ اور کشور گویا سُبکیاں لے رہی تھی۔ بازو اور دبی ہوئی آہیں۔

"لاحول ولا قوۃ" وہ موٹی آواز بولی۔

"سنو تو..... سنو تو" کشور کی پریشان آواز آئی۔ وہ اُس مردود کی التجائیں کر رہی تھی۔ پھر ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کسی کو پکڑ کر گھسیٹ رہا ہو اور وہ خوشامد کرے جاں کنی میں..... پناہ مانگے۔ اور پھر اور بھی گھٹی گھٹی آواز آنے لگی۔ گویا کوئی زبردست درندہ کشور کو بھنبوڑ رہا ہو۔ میری کنپٹیاں پھڑ پھڑانے لگیں نسیں کھنچ گئیں اور ہاتھ اکڑ گئے۔ وہ وقت آ پہنچا تھا۔ میں ایک دم کھڑی ہو گئی!۔

"ہیں ہیں ریحانہ کیا کرتی ہو" راحت نے مجھے روکا۔

"کشور..... میری کشور" میں بےساختہ چیخ پڑی اور دوسرے لمحے دروازہ کا پردہ الگ ہو گیا۔

اوہ، تھوڑی دیر کیلئے میری ساری طاقتیں سلب ہو گئیں۔ بیچوں بیچ کمرے میں ایک الماری سے ذرا ہٹ کر شوکت کے بھیانک اور ظالم بازوؤں میں ایک مردہ چڑیا کیطرح کشور نڈھال ہو رہی تھی اور وہ..... یہ سمجھ لیجئے کہ کبوتر کو آپنے کبھی بچے کو دانہ بھرتے دیکھا ہے بس بالکل ویسے ہی۔ بالکل اُسی طرح۔ دوسرے لمحے شوکت تو سر کھجا کھجا کر پاس ٹنگی ہوئی تصویر میں رنگوں کی آمیزش دیکھ رہے تھے اور کشور جلدی جلدی اپنا بٹوہ کھول اور بند کر رہی تھی۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرہ لال تھا۔

"یہ..... یہ شوکت ہے، ریحانہ..... شوکت" کشور کہہ رہی تھی۔

---

جب میں برآمدے میں سر لٹکائے لڑکھڑاتے قدموں سے واپس ہو رہی تھی تو میں نے منیر کو ایک لمبا سا پارسل لئے دیکھا۔ وہ اُسمیں سے اُسکے لئے نیا ریکیٹ نکال رہا تھا۔ وہ خود اپنی اُنگلی پر انگوٹھی کی چمک دیکھنے میں غرق تھی۔ وہ ہنسے۔

مگر میرے کان میرے جسم سے دُور کہیں موت کا سا نغمہ سُن رہے تھے اور میری آنکھیں فضا میں ہزاروں جنازوں کے جلوس گذرتے دیکھ رہی تھیں!!!

جب میں جاڑوں میں لحاف اُوڑھتی ہوں تو پاس کی دیوار پر اُسکی پرچھائیں ہاتھی کی طرح جھومتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور ایکدم سے میرا دماغ بیتی ہوئی دنیا کے پردوں میں دوڑنے بھاگنے لگتا ہے۔ نہ جانے کیا کچھ یاد آنے لگتا ہے۔

معاف کیجئے گا میں آپ کو خود اپنے لحاف کا رومان انگیز ذکر نہیں بتانے جا رہی ہوں۔ نہ لحاف سے کسی قسم کا رومان جوڑا ہی جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں کمبل کم آرام دہ سہی مگر اُسکی پرچھائیں اتنی بھیانک نہیں ہوتی جتنی ——————— جب لحاف کی پرچھائیں دیوار پر ڈگمگا رہی ہو۔ یہ جب کا ذکر ہے جب میں چھوٹی سی تھی اور دن بھر بھائیوں اور اُن کے دوستوں کے ساتھ مار کٹائی میں گزار دیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ میں کمبخت اتنی لڑاکا کیوں تھی۔ اُس عمر میں جبکہ میری اور بہنیں عاشق جمع کر رہی تھیں میں اپنے پرائے ہر لڑکے اور لڑکی سے جوتم پیزار میں مشغول تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اماں جب آگرہ جانے لگیں تو ہفتہ بھر کے لئے مجھے اپنی ایک منہ بولی بہن کے پاس چھوڑ گئیں۔ اُن کے یہاں اماں خوب جانتی تھیں کہ چوہے کا بچہ بھی نہیں اور میں کسی سے بھی لڑ بھڑ نہ سکوں گی۔ سزا تو خوب تھی میری! ہاں تو اماں مجھے بیگم جان کے پاس چھوڑ گئیں۔ وہی بیگم جان جن کا لحاف ابتک میرے ذہن میں گرم لوہے کے داغ کی طرح محفوظ ہے۔ یہ وہ بیگم جان تھیں جن کے غریب ماں باپ نے نواب صاحب کو اسلئے داماد بنا لیا

کہ گو وہ "پکّی" عمر کے تھے مگر تھے نہایت نیک۔ کبھی کوئی رنڈی یا بازاری عورت ان کے یہاں نظر نہ آئی۔ خود حاجی تھے اور بہتوں کو حج کرا چکے تھے۔

مگر انہیں ایک نہایت عجیب و غریب شوق تھا۔ لوگوں کو کبوتر پالنے کا جنون ہوتا ہے۔ بٹیریں لڑاتے ہیں۔ مرغ بازی کرتے ہیں۔ اِس قسم کے واہیات کھیلوں سے نواب صاحب کو نفرت تھی۔ اُن کے یہاں تو بس طالب علم رہتے تھے۔ نوجوان گورے گورے پتلی کمروں کے لڑکے۔ جن کا خرچ وہ خود برداشت کرتے تھے۔

مگر بیگم جان سے شادی کرکے تو وہ انہیں کُل ساز و سامان کے ساتھ ہی گھر میں رکھ کر بھول گئے۔ اور وہ بچاری دُبلی پتلی نازک سی بیگم تنہائی کے غم میں گھلنے لگیں۔

نہ جانے اُن کی زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ وہاں سے جب وہ پیدا ہونے کی غلطی کر چکی تھیں۔ یا وہاں سے جب وہ ایک نواب کی بیگم بن کر آئیں اور چھپر کھٹ پر زندگی گزارنے لگیں۔ یا جب سے نواب صاحب کے یہاں لڑکوں کا زور بندھا۔ اُن کے لئے مرغن حلوے اور لذیذ کھانے جانے لگے۔ اور بیگم جان دیوان خانے کی درازوں میں سے لچکتی کمروں والے لڑکوں کی چست پنڈلیاں اور معطر باریک شبنم کے کُرتے دیکھ دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگیں۔

یا جب سے جب وہ منتوں مُرادوں سے ہار گئیں، چلّے بندھے اور ٹوٹکے اور راتوں کی وظیفہ خوانی بھی چت ہو گئی۔ کہیں پتھر میں جونک لگتی ہے؟۔ نواب صاحب اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پھر بیگم جان کا دل ٹوٹ گیا اور وہ علم کی طرف متوجہ ہوئیں۔ لیکن یہاں بھی انہیں کچھ نہ ملا۔ عشقیہ ناول اور جذباتی اشعار پڑھ کر اور بھی پستی چھا گئی۔ رات کی نیند بھی ہاتھ سے گئی اور بیگم جان جی جان چھوڑ کر بالکل ہی یاس و حسرت کی پوٹ بن گئیں۔

چولھے میں ڈالا تھا ایسا کپڑا لتّا۔ کپڑا پہنا جاتا ہے کسی پر رعب گانٹھنے کے لئے۔ اب نہ تو نواب صاحب کو فرصت کہ شبنمی کرتوں کو چھوڑ کر ذرا ادھر توجہ کریں اور نہ وہ

اُنہیں کہیں آنے جانے دیتے۔ جب سے بیگم جان بیاہ کر آئی تھیں رشتہ دار آکر مہینوں رہتے اور چلے جاتے۔ مگر وہ بچاری قید کی قید رہتیں۔

اِن رشتہ داروں کو دیکھ کر اور بھی اُن کا خون جلتا تھا کہ سب کے سب مزے سے مال اُڑانے عمدہ گھی نگلنے۔ جاڑے کا ساز و سامان بنوانے آن مرتے اور وہ باوجود نئی روئی کے لحاف کے پڑی سردی میں اکڑا کرتیں۔ ہر کروٹ پر لحاف نئی نئی صورتیں بنا کر دیوار پر سایہ ڈالتا۔ مگر کوئی بھی سایہ ایسا نہ تھا جو اُنہیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہو۔ مگر کیوں جئے پھر کوئی؟ ——— زندگی! بیگم جان کی زندگی جو تھی۔ جینا بدا تھا نصیبوں میں وہ پھر جینے لگیں اور خوب جیئں!۔

رَبّو نے اُنہیں نیچے گرتے گرتے سنبھال لیا۔ چٹ پٹ دیکھتے دیکھتے اُن کا سوکھا جسم بھرنا شروع ہوا۔ گال چمک اُٹھے اور حُسن پھوٹ نکلا۔ ایک عجیب و غریب تیل کی مالش سے بیگم جان میں زندگی کی جھلک آئی۔ معاف کیجئے گا اُس تیل کا نسخہ آپ کو بہترین سے بہترین رسالہ میں بھی نہ ملے گا۔

---

جب میں نے بیگم جان کو دیکھا تو وہ چالیس بیالیس کی ہوں گی۔ اُفوہ کس شان سے وہ مسند پر نیم دراز تھیں اور رَبّو اُن کی پیٹھ سے لگی بیٹھی کمر دبا رہی تھی۔ ایک اُودے رنگ کا دوشالہ اُن کے پیروں پر پڑا تھا اور وہ مہارانی کی طرح شان دار معلوم ہو رہی تھیں۔ مجھ اُن کی شکل بے انتہا پسند تھی۔ میرا جی چاہتا تھا گھنٹوں بالکل پاس سے ان کی صورت دیکھا کروں۔ اُن کی رنگت بالکل سفید تھی۔ نام کو سُرخی کا ذکر نہیں۔ اور بال سیاہ اور تیل میں ڈوبے رہتے تھے۔ میں نے آج تک اُن کی مانگ ہی بگڑی نہ دیکھی۔ کیا مجال جو ایک بال اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ اُن کی آنکھیں کالی تھیں اور ابرو پر کے زائد بال علیحدہ کر دینے سے کمانیں سی کھچی ہوئی تھیں۔ آنکھیں ذرا تنی ہوئی رہتی تھیں۔ بھاری

بھاری پھولے ہوئے پپوٹے، موٹی موٹی پلکیں۔ سب سے زیادہ جو اُن کے چہرے پر حیرت انگیز، جاذبِ نظر چیز تھی وہ اُن کے ہونٹ تھے۔ عموماً وہ سُرخی سے رنگے رہتے تھے۔ اوپر کے ہونٹ پر ہلکی ہلکی مونچھیں سی تھیں اور کنپٹیوں پر لمبے لمبے بال۔ کبھی کبھی اُن کا چہرہ دیکھتے دیکھتے عجیب سا لگنے لگتا تھا۔ کم عمر لڑکوں جیسا!۔

اُن کے جسم کی جلد بھی سفید اور چکنی تھی، معلوم ہوتا تھا کسی نے کس کر ٹانکے لگا دیئے ہوں۔ عموماً وہ اپنی پنڈلیاں کھجانے کے لئے کھولتیں تو میں چپکے چپکے اُن کی چمک دیکھا کرتی۔ اُن کا قد بہت لمبا تھا اور پھر گوشت ہونے کی وجہ سے وہ بہت ہی لمبی چوڑی معلوم ہوتی تھیں لیکن بہت متناسب اور ڈھلا ہوا جسم تھا۔ بڑے بڑے چکنے اور سفید ہاتھ، اور سڈول کمر، تو ربو اُن کی پیٹھ کھجایا کرتی تھی۔ یعنی گھنٹوں اُن کی پیٹھ کھجاتی، پیٹھ کھجوانا بھی زندگی کی ضروریات میں سے تھا۔ بلکہ شاید ضروریاتِ زندگی سے بھی زیادہ۔

ربو کو گھر کا اور کوئی کام نہ تھا بس وہ سارے وقت اُن کے چھپر کھٹ پر چڑھی کبھی پیر کبھی سر اور کبھی جسم کے اور دوسرے حصّے کو دبایا کرتی تھی۔ کبھی تو میرا دل بول اُٹھتا تھا۔ جب دیکھو ربو کچھ نہ کچھ دبا رہی ہیں یا مالش کر رہی ہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میں اپنا کہتی ہوں کوئی اتنا چھوئے بھی تو میرا جسم تو سڑ گل کے ختم ہو جائے۔

اور پھر یہ روز روز کی مالش کافی نہیں تھی۔ جس روز بیگم جان نہاتیں۔ یا اللہ بس دو گھنٹے پہلے سے تیل اور خوشبودار اُبٹنوں کی مالش شروع ہو جاتی۔ اور اتنی ہوتی کہ میرا تو تخیل سے ہی دل ٹوٹ جاتا۔ کمرے کے دروازے بند کر کے انگیٹھیاں سلگتیں اور پھر چلتا مالش کا دور۔ عموماً صرف ربو ہی رہتیں۔ باقی کی نوکرانیاں منہ بناتی بڑبڑاتی دروازہ پر سے ہی ضروریات کی چیزیں دیتی جاتیں۔

بات یہ تھی کہ بیگم جان کو کھجلی کا مرض تھا۔ بیچاری کو ایسی کھجلی ہوتی تھی کہ ہزار

تیل اور ابٹنے ملے جاتے تھے۔ مگر کھجلی تھی کہ قائم۔ ڈاکٹر، حکیم کہتے "کچھ بھی نہیں جسم صاف چٹ پڑا ہے۔ ہاں کوئی جلد کے اندر بیماری ہو تو خیر"۔ "نہیں بھئی یہ ڈاکٹر تو موئے ہیں پاگل ——— کوئی آپ کے دشمنوں کو مرض ہے؟ اللہ رکھے خون میں گرمی ہے۔" ربو مسکرا کر کہتی اور مہین مہین نظروں سے بیگم جان کو گھورتی۔ اوہ یہ ربو ——— جتنی بیگم جان گوری تھی اتنی ہی یہ کالی۔ جتنی بیگم جان سفید تھیں اتنی ہی یہ سرخ۔ بس جیسے تپایا ہوا لوہا۔ ہلکے ہلکے چیچک کے داغ گٹھا ہوا ٹھوس جسم۔ پھرتیلے چھوٹے چھوٹے ہاتھ کسی ہوئی چھوٹی سی توند، بڑے بڑے پھولے ہوئے ہونٹ جو ہمیشہ نمی میں ڈوبے رہتے اور جسم میں سے عجیب گھبرانے والی بو کے شرارے نکلتے رہتے تھے۔ اور یہ ننھے ننھے پھولے ہوئے ہاتھ کس قدر پھرتیلے تھے۔ ابھی کمر پر تو وہ لیجئے پھسل کر گئے کولھوں پر وہاں سے رپٹے رانوں پر اور پھر دوڑ ٹخنوں کی طرف۔ میں تو جب کبھی بیگم جان کے پاس بیٹھتی یہی دیکھتی کہ اب اس کے ہاتھ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں!۔

گرمی جاڑے بیگم جان حیدرآبادی جالی کارگے کے کرتے پہنتیں۔ گہرے رنگ کے پاجامے اور سفید جھاگ سے کرتے اور پنکھا بھی چلتا ہو۔ پھر بھی وہ ہلکی دلائی ضرور جسم پر ڈھکے رہتی تھیں۔ انہیں جاڑا بہت پسند تھا۔ جاڑے میں مجھے بھی ان کے یہاں اچھا معلوم ہوتا۔ وہ ہلتی جلتی بہت کم تھیں۔ قالین پر لیٹی ہیں۔ پیٹھ کھج رہی ہے۔ خشک میوے چبا رہی ہیں اور بس۔ ربو سے دوسری ساری نوکرانیاں خار کھاتی ہیں۔ چڑیل بیگم جان کے ساتھ کھاتی ساتھ اٹھتی بیٹھتی۔ اور ماشاء اللہ ساتھ ہی سوتی تھی۔ ربو اور بیگم جان عام جلسوں اور مجمعوں کی دلچسپ گفتگو کا موضوع تھیں۔ جہاں ان دونوں کا ذکر آیا اور قہقہے اٹھے۔ لوگ نہ جانے کیا کیا چٹکلے غریب پر اڑاتے۔ مگر وہ دنیا میں کسی سے ملتی ہی نہ تھیں۔ وہاں تو بس وہ تھیں اور ان کی کھجلی۔

میں نے کہا نا کہ اس وقت میں کافی چھوٹی تھی اور بیگم جان پر فدا۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتی

پیار کرتی تھیں۔ اتفاق سے اماں آ گئے گئیں۔ انہیں معلوم تھا کہ اکیلے گھر میں بھائیوں سے مار کٹائی ہو گی۔ ماری ماری پھروں گی۔ اس لئے وہ ہفتہ بھر کے لئے بیگم جان کے پاس چھوڑ گئیں۔ میں بھی خوش اور بیگم جان بھی خوش۔ آخر کو اماں کی بھابی بنی ہوئی تھیں۔

سوال یہ اُٹھا کہ میں سوؤں کہاں؟ قدرتی طور پر بیگم جان کے کمرے میں لہٰذا میرے لئے بھی اُن کے چھپر کھٹ سے لگا کر چھوٹی سی پلنگڑی ڈال دی گئی۔ دس گیارہ بجے تک تو باتیں کرتے رہے۔ میں اور بیگم جان چانس کھیلتے رہے اور پھر میں سونے کیلئے اپنے پلنگ پر چلی گئی۔ اور جب میں سوئی تو رَبّو ویسی ہی بیٹھی اُن کی پیٹھ کھجا رہی تھی۔ "بھنگن کہیں کی ——" میں نے سوچا۔ رات کو میری ایکدم سے آنکھ کھلی تو مجھے عجیب طرح کا ڈر لگنے لگا۔ کمرے میں گھُپ اندھیرا۔ اور اس اندھیرے میں بیگم جان کا لحاف ایسے ہل رہا تھا جیسے اُس میں ہاتھی بند ہو۔ "بیگم جان ——" میں نے ڈری ہوئی آواز نکالی۔ ہاتھی ہلنا بند ہو گیا۔ لحاف نیچے دب گیا۔

"کیا ہے —— سو رہو ——" بیگم جان نے کہیں سے آواز دی۔

"ڈر لگ رہا ہے ——" میں نے چوہے کی سی آواز سے کہا۔

"سو جاؤ —— ڈر کی کیا بات ہے —— آیۃ الکرسی پڑھ لو۔"

"اچھا ——" میں نے جلدی جلدی آیۃ الکرسی پڑھی۔ مگر یَعلَمُ مَا بَینَ —— پر ہر دفعہ آ کر اٹک گئی۔ حالانکہ مجھے اس وقت پوری آیۃ یاد ہے۔

"تمہارے پاس آ جاؤں بیگم جان ——"

"نہیں —— بیٹی —— سو رہو ——" ذرا سختی سے کہا۔

اور پھر دو آدمیوں کے کھسر پھسر کرنے کی آواز سنائی دینے لگی —— ہائے رے یہ دوسرا کون؟ میں اور بھی ڈری۔

"بیگم جان ——— چور دور تو نہیں ———"

"سو جاؤ بیٹا ——— کیسا چور ———" رَبّو کی آواز آئی - میں جلدی سے لحاف میں مُنہ ڈال کر سو گئی -

صبح میرے ذہن میں رات کے خوفناک نظارے کا خیال بھی نہ رہا - میں ہمیشہ کی وہمی ہوں - رات کو ڈرنا ، اُٹھ اُٹھ کر بھاگنا اور بڑبڑانا تو بچپن میں روز ہی ہوتا تھا - سب تو کہتے تھے مجھ پر بھوتوں کا سایہ ہو گیا ہے - لہٰذا مجھے خیال بھی نہ رہا - صبح کو لحاف بالکل معصوم نظر آ رہا تھا - مگر دوسری رات میری آنکھ کھلی تو رَبّو اور بیگم جان میں کچھ جھگڑا بڑی خاموشی سے چھپر کھٹ پر ہی طے ہو رہا تھا اور میری خاک سمجھ میں نہ آیا تھا کیا اور کیا فیصلہ ہوا - رَبّو ہچکیاں لیکر روئی - پھر بلّی کی طرح سپڑ سپڑ رکابی چاٹنے جیسی آوازیں آنے لگیں ——— اونھ میں تو گھبرا کر سو گئی -

---

آج رَبّو اپنے بیٹے سے ملنے گئی ہوئی تھی - وہ بڑا جھگڑالو تھا - بہت کچھ بیگم جان نے کیا - اُسے دُکان کرائی ——— گاؤں میں لگایا - مگر وہ کسی طرح مانتا ہی نہیں تھا - نواب صاحب کے یہاں کچھ دن رہا - خوب جوڑے باگے بھی بنے پر نہ جانے کیوں ایسا بھاگا کہ رَبّو سے ملنے بھی نہ آتا ——— لہٰذا رَبّو ہی اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں اُس سے ملنے گئی تھی - بیگم جان نہ جانے دیتی تھیں - مگر رَبّو بھی مجبور ہو گئی -

سارا دن بیگم جان پریشان رہیں - اُن کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا رہا - کسی کا چھونا بھی اُنہیں نہ بھاتا تھا - اُنھوں نے کھانا بھی نہ کھایا اور سارا دن اُداس پڑی رہیں -

"میں کھجا دوں بیگم جان ———" میں نے بڑے شوق سے تاش کے پتّے بانٹتے ہوئے کہا - بیگم جان مجھے غور سے دیکھنے لگیں -

"میں کھجا دوں ——— سچ کہتی ہوں ———" میں نے تاش رکھ دیئے -

میں تھوڑی دیر تک کھجاتی رہی اور بیگم جان چپکی لیٹی رہیں۔ دوسرے دن رّبّو کو آنا تھا ——— مگر وہ آج بھی غائب تھی۔ بیگم جان کا مزاج چڑچڑا ہوتا گیا ——— چائے پی پی کر اُنھوں نے سَر میں درد کرلیا۔

میں پھر کھجانے لگی اُن کی پیٹھ ——— چکنی میز کی تختی جیسی پیٹھ ——— میں ہولے ہولے کھجاتی رہی۔ اُن کا کام کرکے کیسی خوشی ہوتی تھی!۔

"ذرا زور سے کھجاؤ ——— بند کھول دو ———" بیگم جان بولیں۔ "اِدھر ——— اے ہے ذرا شانے سے نیچے ——— ہاں ——— واہ بھئی واہ ——— ہا ——— ہا ———" وہ سرور میں ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لیکر اطمینان ظاہر کرنے لگیں۔

"اور اِدھر ———" حالانکہ بیگم جان کا ہاتھ خوب جاسکتا تھا۔ مگر وہ مجھ سے ہی کھجوا رہی تھیں اور مجھے اُلٹا فخر ہو رہا تھا۔ "یہاں ——— اوئی ——— تم تو گدگدی کرتی ہو ——— واہ ———" وہ ہنسیں۔ میں باتیں بھی کر رہی تھی اور کھجا بھی رہی تھی۔

"تمہیں کل بازار بھیجوں گی ——— کیا لوگی ——— وہی سوتی جاگتی گڑیا ———"

"نہیں بیگم جان ——— میں تو گڑیا نہیں لیتی ——— کیا بچہ ہوں اب میں ———"

"بچہ نہیں تو کیا بوڑھی ہوگئی ———" وہ ہنسیں ——— "گڑیا نہیں تو بُوا لینا ——— کپڑے پہنانا خود۔ میں دوں گی تمہیں بہت سے کپڑے ——— سُنا ———" اُنہوں نے کروٹ لی۔

"اچھا" میں نے جواب دیا۔

"اِدھر ———" اُنھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر جہاں کھجلی ہو رہی تھی رکھدیا۔ جہاں

انہیں کھجلی معلوم ہوتی وہاں میرا ہاتھ رکھ دیتیں اور میں بے خیالی میں بھوسے کے دھیان میں ڈوبی مشین کی طرح کھجاتی رہی اور وہ متواتر باتیں کرتی رہیں۔

" سنو تو ـــــ تمہاری فراکیں کم ہو گئی ہیں۔ کل درزی کو دیدوں گی۔ کہ نئی سی لائے۔ تمہاری اماں کپڑا دے گئی ہیں۔"

" وہ لال کپڑے کی نہیں بنواؤں گی ـــــ چماروں جیسا ہے ـــــ" میں بکواس کر رہی تھی اور ہاتھ نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچا۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم بھی نہ ہوا۔ بیگم جان تو چت لیٹی تھیں ـــــ ارے ـــــ میں نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

" اوئی لڑکی ـــــ دیکھ کر نہیں کھجاتی ـــــ میری پسلیاں نوچے ڈالتی ہے ـــــ" بیگم جان شرارت سے مسکرائیں اور میں جھینپ گئی۔

" ادھر آکر میرے پاس لیٹ جا ـــــ" انہوں نے مجھے بازو پر سر رکھکر لٹا لیا۔

" اے ہے کتنی سوکھ رہی ہے ـــــ پسلیاں نکل رہی ہیں۔" انہوں نے میری پسلیاں گننا شروع کیں۔

" اوں ـــــ" میں منمنائی۔

" اوئی ـــــ تو کیا میں کھا جاؤں گی ـــــ کیسا تنگ سوئٹر بنا ہے! ـــــ"

" گرم بنیان بھی نہیں پہنا تم نے ـــــ" میں کلبلانے لگی۔

" کتنی پسلیاں ہوتی ہیں ـــــ" انہوں نے بات بدلی۔

" ایک طرف نو اور ایک طرف دس۔" میں نے اسکول میں یاد کی ہوئی ہائی جین کی مدد لی۔ وہ بھی اوٹ پٹانگ۔

" ہٹاؤ تو ہاتھ ـــــ ہاں، ایک ـــــ دو ـــــ تین" ـــــ

میرا دل چاہا کسی طرح بھاگوں ـــــ اور انہوں نے زور سے بھینچا۔

"اوں ——— " میں مچل گئی ——— بیگم جان زور زور سے ہنسنے لگیں۔
اب بھی جب کبھی میں اُن کا اُس وقت کا چہرہ یاد کرتی ہوں تو دل گھبرانے لگتا ہے۔
اُن کی آنکھوں کے پپوٹے اور وزنی ہو گئے تھے۔ اوپر کے ہونٹ پر سیاہی گھری ہوئی
تھی۔ باوجود سردی کے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ہونٹوں اور ناک پر چمک رہی تھیں۔
اُن کے ہاتھ ٹھنڈے یخ تھے۔ مگر نرم نرم۔ جیسے اُن پر کی کھال اُتر گئی ہو۔ انہوں نے
شال اُتار دی تھی اور کارگے کے مہین کرتے میں سے اُن کا جسم آٹے کی لوئی کی طرح چمک رہا
تھا۔ بھاری جڑاؤ سونے کے بٹن گریبان کے ایک طرف جھول رہے تھے۔ شام ہو گئی تھی
اور کمرہ میں اندھیرا گھٹ رہا تھا۔ مجھے ایک نامعلوم ڈر سے وحشت سی ہونے لگی بیگم جان
کی گہری گہری آنکھیں۔ میں رونے لگی دل میں۔ وہ مجھے ایک مٹی کے کھلونے کی طرح
بھینچ رہی تھیں۔ اُن کے گرم گرم جسم سے میرا دل بولانے لگا۔ مگر اُن پر تو جیسے کوئی بھتنا
سوار تھا اور میرے دماغ کا یہ حال کہ نہ چیخا جائے اور نہ رو سکوں۔
تھوڑی دیر کے بعد وہ پست ہو کر نڈھال لیٹ گئیں۔ اُن کا چہرہ پھیکا اور بدرونق
ہو گیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگیں۔ میں سمجھی کہ اب مریں یہ اور وہاں سے اُٹھ کر سرپٹ بھاگی
باہر ——— !
شکر ہے ربّو رات کو آ گئی اور میں ڈری ہوئی جلدی سے لحاف اوڑھ سو گئی ———
مگر نیند کہاں۔ چپ گھنٹوں پڑی رہی۔
اماں کسی طرح آ ہی نہیں چکی تھیں۔ بیگم جان سے مجھے ایسا ڈر لگتا تھا کہ میں سارا دن
ماماؤں کے پاس بیٹھی رہی۔ مگر اُن کے کمرے میں قدم رکھتے دم نکلتا تھا۔ اور کہتی کس سے
اور کہتی ہی کیا کہ بیگم جان سے ڈر لگتا ہے؟ تو یہ بیگم جان جو میرے اوپر جان چھڑکتی تھیں۔

***

آج ربّو میں اور بیگم جان میں پھر اَن بن ہو گئی ——— میری قسمت کی خرابی کہئے

یا کچھ اور مجھے اُن دونوں کی اَن بن سے ڈر لگا۔ کیونکہ فوراً ہی بیگم جان کو خیال آیا کہ میں باہر سردی میں گھوم رہی ہوں اور مری گی نمونیہ میں۔

" لڑکی کیا میرا سر منڈوائے گی۔ جو کچھ ہو ہوا گیا تو اور آفت آئے گی۔" اُنھوں نے مجھے پاس بٹھالیا۔ وہ خود منہ ہاتھ سلفچی میں دھو رہی تھیں۔ چائے تپائی پر رکھی تھی۔

" چائے تو بناؤ ـــــــ ایک پیالی مجھے بھی دینا ـــــــ وہ تولیہ سے منہ خشک کر کے بولیں ـــــــ میں ذرا کپڑے بدل لوں۔"

وہ کپڑے بدلتی رہیں اور میں چائے پیتی رہی۔ بیگم جان نائن سے پیٹھ ملواتے وقت اگر مجھے کسی کام سے بلاتیں تو میں گردن موڑے موڑے جاتی اور واپس بھاگ آتی۔ اب جو اُنھوں نے کپڑے بدلے تو میرا دل اُلٹنے لگا۔ منہ موڑے میں چائے پیتی رہی۔

" ہائے اماں ـــــــ " میرے دل نے بیکسی سے پکارا ـــــــ " آخر ایسا میں بھائیوں سے کیا لڑتی ہوں جو تم میری مصیبت ـــــــ " اماں کو ہمیشہ سے میرا لڑکوں کے ساتھ کھیلنا ناپسند ہے۔ کہو بھلا لڑکے کیا شیر چیتے ہیں جو نگل جائیں گے۔ اُن کی لاڈلی کو۔ اور لڑکے بھی کون؟ خود بھائی اور دو چار سڑے سڑائے ذرا ذرا سے اُن کے دوست۔ مگر نہیں وہ تو عورت ذات کو سات تالوں میں رکھنے کی قائل اور یہاں بیگم جان کی وہ دہشت کہ دنیا بھر کے غنڈوں سے نہیں۔ بس چلتا تو اُس وقت سڑک پر بھاگ جاتی۔ پر وہاں نہ ٹکتی۔ مگر لاچار تھی۔ مجبوراً کلیجہ پر پتھر رکھے بیٹھی رہی۔

کپڑے بدل سولہ سنگھار ہوئے۔ اور گرم گرم خوشبوؤں کے عطر نے اور بھی اُنہیں انگارہ بنا دیا اور وہ چلیں مجھ پر لاڈ اُتارنے!۔

" گھر جاؤں گی ـــــــ " میں نے اُن کی ہر رائے کے جواب میں کہا اور رونے لگی۔

" میرے پاس تو آؤ میں ـــــــ تمہیں بازار لے چلوں گی ـــــــ سنو تو ـــــــ "

مگر بیس کھلی کی طرح پھیل گئی ——— سارے کھلونے۔ مٹھائیاں ایک طرف اور گھر جانے کی رٹ ایک طرف۔

"وہاں بھیا ماریں گے ——— چڑیل ———" انہوں پیار سے مجھے تھپڑ لگایا۔

"پڑے ماریں بھیا ———" میں نے دل میں سوچا۔ اور روٹھی اکڑی بیٹھی رہی۔

"بچی امیاں کھٹی ہوتی ہیں بیگم جان ———" جلی کٹی ربو نے رائے دی۔ اور پھر اس کے بعد بیگم جان کو دورہ پڑ گیا۔ سونے کا ہار جو وہ تھوڑی دیر پہلے مجھے پہنا رہی تھیں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مہین جالی کا دوپٹہ تار تار۔ اور وہ مانگ جو میں نے کبھی بگڑی نہ دیکھی تھی جھاڑ جھنکاڑ ہو گئی۔

"اوہ ——— اوہ اوہ اوہ ———" وہ جھٹکے لے لیکر چلانے لگیں۔ میں رپٹی باہر!

بڑے جتنوں سے بیگم جان کو ہوش آیا۔ جب میں سونے کے لئے کمرے میں دبے پیر جا کر جھانکی تو ربو ان کی کمر سے لگی جسم دبا رہی تھی۔

"جوتی اُتار دو ———" اُس نے اُن کی پسلیاں کھجاتے ہوئے کہا۔ اور میں چوہیا کی طرح لحاف میں دبک گئی۔

سر سر پھٹ کچ ——— بیگم جان کا لحاف اندھیرے میں پھر ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا۔ اللہ! ۔ آں ———" میں نے مری ہوئی آواز نکالی۔ لحاف میں ہاتھی پھدکا اور بیٹھ گیا۔ میں بھی چپ ہو گئی۔ ہاتھی نے پھر لوٹ مچائی۔ میرا رُواں رُواں کانپا۔ آج میں نے دل میں ٹھان لیا کہ ضرور ہمت کر کے سرہانے کا لگا ہوا بلب جلا دوں۔ ہاتھی پھر پھڑپھڑا رہا تھا۔ اور جیسے اکڑوں بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چپڑ چپڑ کچھ کھانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ جیسے کوئی مزے دار چٹنی چکھ رہا ہو۔ اب میں سمجھی! یہ بیگم جان نے آج کچھ نہیں کھایا۔ اور ربو مُردی تو ہے سدا کی چٹو۔ ضرور یہ تر مال اُڑا رہی ہے۔ میں نے نتھنے پھیلا کر سوں سوں ہوا کو سونگھا۔ سوائے عطر صندل اور حنا کی گرم گرم خوشبو

کے اور کچھ نہ محسوس ہوا۔

لحاف پھر اُمنڈنا شروع ہوا۔ میں نے بہتیرا چاہا کہ چپکی پڑی رہوں۔ مگر اُس لحاف نے تو ایسی عجیب عجیب شکلیں بنانی شروع کیں کہ میں لرز گئی۔ معلوم ہوتا تھا غوں غوں کر کے کوئی بڑا سا مینڈک پھول رہا ہے اور اب اچھل کر میرے اوپر آیا۔

"آ ——— ن ——— اماں" ——— میں ہمت کر کے گنگنائی مگر وہاں کچھ شنوائی نہ ہوئی اور لحاف میرے دماغ میں گھس کر پھولنا شروع ہوا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پلنگ کے دوسری طرف پیر اُتارے اور ٹٹول کر بجلی کا بٹن دبایا۔ ہاتھی نے لحاف کے نیچے ایک قلابازی لگائی اور پچک گیا۔ قلابازی لگانے میں لحاف کا کونا فٹ بھر اُٹھا ——— اللہ! میں غڑاپ سے اپنے بچھونے میں!!۔

اور پھر دندناکر بخار چڑھتا اور کٹکٹی بندھ جاتی۔ معلوم ہوتا ہڈیاں چٹ چٹا رہی ہیں اور کھال جھلسنے لگتی۔ گلے میں جیسے رہٹ چلنے لگتا۔ چوں، چر ——— شر رُد کھڑ اور پھر کھانسی کے پھندے پڑنے لگتے۔

زبان تو جوتے کا تلا ہوگئی تھی۔ بکھٹی بکھٹی سڑاندی دوائیں کھاتے کھاتے اُس میں جو گلٹیاں ہوتی ہیں وہ بھی مردہ ہوگئی تھیں۔ اُسے یاد آتا تھا جبکہ وہ چھوٹا سا تھا تو کونین کتنی کڑوی، املیاں کتنی کھٹی اور شکر کی گولیاں کتنی میٹھی ہوتی تھیں! اسکی زبان کیسی جاندار اور حساس تھی! اور اب وہی زبان کسقدر ڈھیٹ ہوگئی تھی کہ کسی چیز کا اثر بھی نہ ہوتا تھا۔

بچے آنگن میں کلکاریاں مارتے اور ایسا معلوم ہوتا گویا اس کے کلیجے پر گھن برس رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے دَوڑتے ہوئے دروازے دھڑدھڑاتے ہوئے نکل جاتے اور اُسکی زندہ لاش سر سے پَیر تک لرز جاتی۔ پھر دوسری آوازیں، بھونپو والی لاریاں، کوکتی ہوئی موٹریں، کھڑکھڑاتے تانگے اور ممناتی ہوئی سائیکلیں، سب گویا اُسکے سینہ پر سے دندناتی گذرتیں۔

"رام رام ست ہے" اُس کا کلیجہ مسل جاتا۔

"لینا دوڑنا ——— چلیو!" وہ اپنا منہ، مجونوں میں بسے ہوئے لحاف

میں دبا لیتا۔ گویا لوگ اُسے ہی مارنے دوڑ رہے ہیں۔

اور کُتّے ؟ کُتّے تو شیر تھے ، اُن کا بس نہ تھا جو اُس کی گود میں لیٹ لیٹ کر بھونکتے اور بلّیوں کو تو رات کے وقت کورٹ شپ کے لئے اسی کے کمرے میں آنا فرض تھا! اسکی "شی شی" اور "ہُش ہش" پر بلّیاں مُسکرا مسکرا کر اپنے عاشق بلّوں کی طرف نیم باز آنکھوں سے دیکھتیں اور اٹھلاتی ہوئی "میاؤں" کر کے وہیں پر جاتیں، دو ایک دفعہ ڈرنے کے بعد اب وہ بھاگنا بے وقوفی سمجھتی تھیں۔

اور پھر ہُوا! خاک پڑی ہر درز اور چھید سے چنگھاڑتی ہوئی سیدھی اُسی کی طرف لپکتی اور اُس کے جسم میں ٹھنڈ کے انجکشن دینا شروع کر دیتی۔ سر سر کرتی، دریا کی طرح اُس کے کانوں میں گرتی اور گردن میں سے پھسلتی ہوئی ٹھیک سینے پر جم جاتی۔ گرمیوں میں یہی ہوا ریت کے گرم گرم ذرّے لا کر اُس کے جسم پر چنگاریوں کی طرح چپکاتی اور اُسے بھٹّی میں سونے کا مزہ آ جاتا۔ وائے موسم!

پر سب سے زیادہ دکھ دینے والی جو بات تھی وہ اس کا موٹا پڑوسی تھا۔ سُرخ چقندر، بڑی گھندار مونچھوں والا، وہ آ کر دھپ سے بیٹھ جاتا۔ اور مونڈھا لبا لب اُس کے جسم سے بھر جاتا۔

"کیسے ہو؟" وہ بغیر بھولے ہوئے ہمیشہ ایک ہی لہجے میں کہتا۔

اور پھر "بھابی ذرا پان تو دیجو ایک" وہ اُس کی بیوی سے فرمائش کرتا۔ مُرجھائی ہوئی، آدھے درجن بچّوں کی ماں کا لکیروں زدہ لاکٹھئی رنگ کا چہرہ ذرا دیر کو مُسکرا اُٹھتا۔

"کبھی دہی بڑے کھلاؤ نا" یا "بھابی آج تو سٹر پلاؤ کھا کر ہی جاؤں گا" وہ دھنسی ہوئی تیمارداری کی عادی آنکھیں تھرکنے لگتیں۔ پپوٹے جھک جاتے۔ اور پھر وہ اُسے کچھ نہ کچھ چھینکے پر سے دیتے یا کوئی اچار یا چٹنی چکھانے دوسرے

برآمدے میں لے جاتی۔ وہاں سے اُس کی چپڑ چپڑ کھانے اور بیوی کے کھلکھلانے کی آواز آنے لگتی۔

اِس وقت فوراً اُسے یا تو رفع حاجت کی اشد ضرورت لاحق ہو جاتی۔ یا پیاس اُٹھ کھڑی ہوتی۔ یا اُس کے کسی نہ کسی حصّۂ جسم کو دبنے۔ یا سہلے جانے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی۔

اُس کے کئی بار پکارنے پر وہ جلی کٹی آتی۔ آنکھیں گھومی ہوئی اور چہرہ تنا ہوا۔ گویا وہ قہقہے جو اُسے دیوانہ کئے دے رہے تھے کچھ دیر پہلے اِن ہونٹوں سے نہیں گذرے تھے۔ بلکہ کہیں کسی اور ہی دُنیا سے آئے تھے۔ وہ گھور گھور کر اُس کے مُنہ کو تکتا گویا وہاں کوئی چیز چپکی ہی تو رہ گئی ہوگی۔

پانی پیتے اور ہاتھ پیر سَہلواتے سَہلواتے وہ تھک جاتا۔ مگر برآمدے میں بیٹھے ہوئے جبڑے ویسے ہی چکّی کی طرح چلا کرتے۔ گویا انہوں نے اسکی ہستی ہی کو چبا ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو!۔

وہ بیمار تھا تو کیا۔ دل تو مردہ نہ ہوا تھا۔

پر اس میں بیوی کا کیا قصور تھا۔ وہ تو جوان تھی اور رگوں میں خون دوڑ رہا تھا۔ مگر وہ کبھی جھوٹ موٹ کو بھی اس سے کچھ کہتا تو وہ اینٹھ جاتی۔

" اے چلو مجھے یہ چونچلے نہیں پسند!" اور اس کا تنکے جیسا ہاتھ ہوا میں جھولتا رہ جاتا۔ کبھی انہیں چونچلوں کے مارے اُس کا سیکے میں گھڑی بھر دل نہ لگتا تھا۔ دن دن بھر وہ دونوں ہوتے تھے اور بند کمرہ۔ یہی ہاتھ کتنے شریر تھے! اور اس پڑوسی نے تو اس کی بدھیا ہی بٹھا دی تھی۔ وہ خود نہ آتا تو قمیص میں بٹن ہی ٹانکنے کو بھیج دیتا۔ اور بیوی جان جان کر سیتے میں اُسے اپنے جسم پر ڈالتی۔ گو وہ چاہتی تو مزے سے الگ سے ہی سی سکتی تھی۔ وہ تو پڑوسی نہیں تو اُس کا کرتا، یا پاجامہ، یا موزہ ہی اُس کی چھاتی پر مونگ دلنے کو

آن موجود ہوتا۔ اول تو تھا ہی کتنا خون جسم میں، پر جو بھی کچھی دو چار بوندیں تھیں وہ پڑی سن سن کھولا کرتیں۔ اوہ! اس کا جی چاہتا تھا اپنی سوکھی سوکھی انگلیوں سے موٹے پڑوسی کے جسم پر سے گوشت کی تہیں کی تہیں اکھیڑ ڈالے اور اوپر سے نمک، بُرکے، مرچیں ملا کر، اور اسوقت اُس کی زبان کا مرده بن جاتا رہتا!۔

خاموش لیٹ کر وہ بیوی کو کسی کام میں مشغول دیکھتا!۔ اُس کے تخیّل میں اُسے صاف موٹے پڑوسی کی پرچھائیں نظر آتی۔ کاش وہ کسی ترکیب سے اس معاش عورت کے خیالات کو قید کر سکتا! اُس کا بس چلتا تو اسے سوچنے ہی نہ دیتا، پر وہ تو گویا خاموش طعنے سے دیتی تھی۔

"لو پکڑلو میرے خیالوں کی ڈور کو!" وہ چڑ جاتا۔ بدگمانیاں بڑھتیں، اُسے اپنے سب بچے پڑوسی کی شکل کے معلوم ہونے لگتے۔ ویسی ہی ناچتی ہوئی آنکھیں، موٹے موٹے بدن، وہی گھومے ہوئے پاؤں اور سوجے ہوئے ٹخنے، بالکل پڑوسی جیسے، اور وہ انہیں قریب بلا کر گھور گھور کر دیکھتا۔ کبھی شک مٹتا کبھی اور جم جاتا اور وہ پاگل ہونے لگتا۔ اُس کا دماغ قلابازیاں کھانے لگتا۔ یہاں تک کہ اُسے بیوی کے پیٹ میں صاف صاف پڑوسی کی شکل کے بچے نظر آنے لگتے۔ وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھتا اور اُسے قریب بلا کر گھورتا۔ اوہ دھوبن بھی کتنی بے وقوف ہے۔ آخر ساڑھیوں میں اتنا کلف دینے کی کیا ضرورت ہے؟ انسان کا دُبلا ہی کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ انسان کتنا پھول جاتا ہے۔ خواہ مخواہ!۔

"دھوبن حرامزدی سے کہو اتنا کلف نہ دے۔" وہ جھلّاتا۔

"کیوں؟ اب کلف اور ساڑھیوں میں بھی تمہارا دخل ہو گیا؟" وہ تنک کر جواب دیتی۔ ساڑھیوں میں تو اس کا دخل بے شک نہیں، پر آخر کیوں؟۔ اور بجارا انگڑائیاں لیتا، اُس کی سوکھی پنڈلیاں پھٹنے لگتیں اور پھیپھڑے زخمی کبوتروں کی طرح پھڑ پھڑاتے۔ کن پٹیاں پھدکنے لگتیں۔ اُس کا جی چاہتا بیوی کی گردن پکڑ کر اتنی مروڑے کہ اس کا

ترچہرہ پھٹ جائے اور پھر اس کی ناک کاٹ ڈالے۔ ناک کاٹنا گو اب بالکل فیشن میں نہیں سمجھا جاتا۔ پر اُسے تو ہر لمحہ تخیّل کی دُنیا میں بیوی کی ناک کاٹتے ہی گذرتا۔ وہ دیکھتا کہ اُس نے ناک کاٹ ڈالی ہے اور چاقو کی نوک سے اُس کے چہرہ پر باریک باریک چارخانہ کاڑھ رہا ہے۔ وہ چونک کر بیوی کے چہرے کو دیکھتا۔ بیشک اسکے سارے مُنہ پر باریک باریک لکیریں نظر آتیں۔ لوگ کہتے تھے کہ پریشانی کی وجہ سے پڑگئی ہیں، پر وہ خوب جانتا تھا اور دل ہی دل میں ہنستا تھا۔ یہ وہی تو لکیریں تھیں جو وہ چاقو سے اپنے تخیّل کی دنیا میں کاڑھا کرتا تھا۔

رات کو بخار نئی قلا بازی لگاتا۔ کوئی ٹکڑا جسم کا یخ ہو جاتا اور کوئی انگارے کی طرح بھڑکا کرتا۔ آنکھیں جلتیں تو ناک برف کی ڈلی ہو جاتی اور ہتھیلیاں سلگتیں تو پنجے گلنے لگتے۔ گلے میں جیسے کوئی دہی بلو رہا ہے۔ گُدّی سُن ہو جاتی۔ ڈاکٹر ٹٹول ٹٹول اُس کے جسم پر گوشت کی بوٹیوں میں سوئیاں لگاتا۔ کولھوں میں گُٹھلیاں پھانسوں کی طرح چبھتیں۔

ذرا آنکھ لگی اور جیسے کسی نے ہزاروں روئی کے گٹھر کے گٹھر اُس پر کھول کر بکھیر دیئے۔ اور وہ سبکیاں لے لیکر اُس میں ڈبکیاں لگاتا۔ ہاتھیوں کی وضع کے جانور اُس کے سینے پر کودتے اور پنڈلیوں میں جیسے کوئی دُرّے لگا رہا ہے۔ پلنگ کے نیچے سے سینکڑوں سوکھے بے گوشت ہاتھ اُس کی طرف بڑھتے۔ اُس کی کن پٹیوں پر مہین مہین غیر انسانی انگلیاں رینگتیں۔ خوابوں میں اُس کے کُل مردہ عزیز ہاتھ پھیلا پھیلا کر اُسے بُلاتے۔ بوڑھی دادی اپنا ڈگڈگاتا ہوا سر ہلا کر اُسے پھسلاتی مگر وہ بڑی خوش اسلوبی سے ان لوگوں کو ٹال کر صاف لوٹ آتا۔ کہتے ہیں کہ خواب میں اگر کوئی مردہ عزیز بلائے اور اُس کے ساتھ چلے جاؤ تو فوراً مر جاتے ہیں! وہ ان روحانی چالوں کو خوب جانتا تھا اور کوئی اُلّو نہ تھا جو چکر میں آجاتا۔ آخر کیوں مرے وہ؟ وہ انتقاماً

جی رہا تھا۔ لوگوں کو کیوں آخر اُس کی موت کی اُمیدیں لگی ہوئی تھیں؟ نہیں مرتا وہ! پھر؟ کسی کو کیا؟۔

وہ لوگوں کے سامنے اور اکڑ کر لیٹتا۔ کوئی ذراسی بھی بات ہوتی تو بہادر اور چھلّے مزاج والے جوانوں کی طرح کڑک کر بولتا۔ لوگوں کے ہمدردی سے افسردہ چہروں کو دیکھ کر وہ سلگ اُٹھتا۔ جی چاہتا کہ اُن کی تھوتھنیوں کو کچل دے۔ جوں جوں وہ اپنے کو تندرست دکھاتا لوگ متفکر ہوتے جاتے۔

"سنبھالا لے رہا ہے!" وہ سر ہلا ہلا کر کہتے۔

لوگ اُسے جانے کیا سمجھتے تھے۔ کبھی وہ بھی دن تھے جب کنبے رشتہ کی ساری کنواریاں اُس سے بچائی جاتی تھیں۔ جیسے وہ انہیں کھا ہی تو جاتا۔ اور وہ لڑکیاں بھی تو اُسے دیکھتے ہی تلملا اُٹھتیں۔ اُن کے چہرے تمتما اُٹھتے اور جو کام کرتی ہوتیں وہ اُن کے ہاتھ سے چھوٹ پڑتا۔ بھاگتیں تو فوراً اگر پڑتیں، مُنہ ڈھانکنا چاہتیں تو دوپٹہ ہی اُتر جاتا اور وہ بے بس اُس کے رحم و کرم پر رہ جاتیں۔ اور وہ تھا بھی بڑا رحم دل!۔

اِتنی ڈھیر سی لڑکیاں اُس سے شرماتی تھیں کہ وہ کچھ فیصلہ بھی تو نہ کر سکتا تھا۔ کبھی منجھو پر وہ "مرجاتا"۔ کبھی جائی اُس کے دل کا ٹکڑا بن جاتی اور کبھی اِن سب کو مع اِس پُر ہوس دُنیا کے وہ چھوڑ کر منّی کا پُجاری بن جاتا اور پھر کبھی ایک دم سے گڑبڑا کر وہ سب پر ایکدم ہی ٹوٹ پڑتا!۔

پر اب تو عرصہ سے اُس سے شرمانا ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ مہترانی کی جوان بہو۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایسے باتیں کر لیتی جیسے وہ کوئی بلّی یا چوہا ہے۔ اور منجھو بی جن سے قریب قریب آدھی منگنی ہو گئی تھی اور شادی سے پہلے اُس کے آنے کی خبر سُن کر اُن پر ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ مزے سے بیٹھی اپنے بچّے کو اُس کے سامنے ہی دودھ پلایا کرتی

اور جاتی اپنی پوشیدہ بیماریوں کا ذکر اُس کے ڈاکٹر سے اُسی کے سامنے کھلے بندوں کرتی۔ لوگ اُسے خطرے کی حدوں سے باہر کہہ چکے تھے۔ اُس کی زندگی کے بہترین زمانے کو ناعاقبت اندیشی کا زمانہ کہہ کر معاف کر چکے تھے۔ ایک دفعہ اس نے چاہا کہ ان لوگوں کے ذرا ہوش ٹھکانے کردے اور وہ نوجوان ماما کو دیکھ کر کچھ بڑبڑایا۔ پھر وہ ہنسنے لگی۔

"اے ہے بھیّا کا بخار بہت ہی چڑھ رہا ہے۔" وہ اٹھلاتی ہوئی چل دی۔ سب اُسے بھیّا کہنے لگے تھے۔ جب سے وہ بیمار پڑا تھا لوگ بن بن کر اُسے جلاتے تھے۔ یہاں تک کہ اُس کا بوڑھا چچا تک اُسے "بھیا" کہہ کر چمکارتا تھا۔ بڈھا اینٹھتا تھا۔ سمجھتا تھا کہ وہ اُسکے اتنا بھی نہیں جینے کا اور بہت جلد دوسری دنیا کو کوچ کر جائے گا۔ ہونہہ! لوگ آس لگائے لگائے مر جائیں گے۔ مگر وہ ضد میں نہیں مرے گا۔ وہ جئے گا! جئے جائے گا! خواہ کتنے ہی لرزے چڑھیں۔ پھیپھڑے دکھیں۔ پڑوسی آئیں اور بیوی مسکرا مسکرا کر اُن کے سڑاندے موزے لئے پر وہ جئے گا۔ خواہ اُس کے سب بچّے پڑوسی کے ہم شکل ہو جائیں۔ سب پڑوسی سے ملنے لگیں، اُس کے بھائی، ماں باپ بہن سب پڑوسی کی طرح آنکھیں مٹکائیں اور پاؤں گھمالیں ٹخنے سوجالیں پر وہ جئے گا۔ انتقاماً جئے گا!! یہ تو ہونے سے رہا کہ وہ لوگوں کے اطمینان کو مر جائے۔

وہ دیکھتے ہی انسان کو بھانپ جاتا۔ وہ اپنی عیادت کرنے والوں کے چہروں کو غور سے دیکھتا۔ اگر اُن پر افسردگی چھائی ہوتی تو وہ بگڑ جاتا۔ یہ سب مفسدوں کے چہرے ہوتے اور وہ انہیں جلے کٹے جواب دیتا۔ جو لوگ مریض کا دل خوش کرنے کو ذرا مسکرا کر آتے انہیں وہ مکّار سمجھتا۔ وہ اُلّو سمجھتے تھے کیا؟ — وہ گھر سے ہی اُسے "بس اب اچھے ہو جاؤ گے۔" "اللہ نے چاہا تو جلد شفا ہوگی۔" جیسے سنانے آتے تھے اور ایسے لوگوں کے نازک معاملات پر گفت و شنید شروع کر دیتا۔ اُن کے چہروں سے مسکراہٹ اُڑ جاتی۔ اور وہ بدحواس ہو جاتے اور جو اگر کسی کے چہرے سے کچھ بھی نہ

ظاہر ہوتا تو وہ اُسے پکّا اُلّو سمجھ لیتا۔ وہ اُسے عجیب و غریب طریقوں سے نقصان اٹھانے ذلیل ہونے، لٹھ بازی کرنے اور مقدمہ چلانے کے فوائد سمجھایا کرتا۔ یہاں تک کہ عیادت کو آنے والے کے چہرے پر وحشت اور جنون کے تسلّی بخش آثار نظر آنے لگتے۔ تب وہ اطمینان سے ہنستا۔ اور آؤ گے ؟ خواہ مخواہ! وہ دل ہی دل میں اُس سے پوچھتا۔

جتنے ڈاکٹر آتے بدمزہ سے بدمزہ دوا تجویز کرتے، اس کے سینے پر مالش کرانے یا انجکشن لگانے کے بہانے اُس کی بیوی کی فضول مدد کے خواستگار ہوتے۔ وہ بے بات بھی اسکی انگلیاں ٹٹولتے اور خون کی کمی وغیرہ کے بہانے اُسے مرغن کھانے اور لذیذ دوائیں کھانے کو بتا جاتے۔ کوئی ہی ایسا ڈاکٹر ہوگا جس نے فوراً بیوی کے لئے نسخہ پر نسخہ نہ لکھ دیا ہوا۔ وہ انہیں موٹی موٹی گالیاں دیتا اور کل بیوی کے نسخے پھاڑ ڈالتا۔ اُس کا بس نہیں تھا کہ مُٹھی بھر اپنے جراثیم کچھاڑ کر پلا دیتا۔

کبھی وہ بھی زمانہ تھا کہ یہی بیوی اُس کے جنم مرن کی ساتھی بنی تھی اور سنگ میں جان دینے کے وعدے کر چکی تھی پر اب جراثیم کے ڈر سے فینائل سے ہاتھ دھوتی اور سوڈے سے غرارے کرتی تھی۔ کتنی گہری خلیج دونوں میں حائل ہو گئی تھی!۔

اور پھر بخار چڑھتا۔ پھیپھڑے پھولتے۔ گلے میں گاڑی سی چلتی، ہڈیاں چٹختیں اور وہ جسمانی اور روحانی دکھوں میں ڈوب جاتا۔

---

"اے لو سوا سات سیر کے ——— چھوٹے سیر سے۔" رشید کی ماں نے اپنا سوکھا ہوا ہاتھ رضائی سے نکال کر پھر واپس رکھ لیا۔ گویا اس جھنگ مولی دنیا سے دستبردار ہو گئیں۔

"اور گھی وہی گھا سلیٹ کا بہن، لالہ جی تو مُنہ پر نہیں دھرتے ہیں تو دودھ منگا کر گھر میں بلو لیتی ہوں۔ اور چھاچھ بھی کام ہی آجاتی ہے۔" سٹھانی نے کنجوسی سے متاثر ہو کر کہا۔

"ترکیب تو اچھی ہے۔ رشید بھی گھی دیکھ کر مُنہ بناتا ہے۔ کہتا ہے روکھی کھا لوں گا۔ پر گھا سلیٹ تو نہیں چلتا۔ بہت کچھ کرتی ہوں بہن میری بلونا اب کون کرے۔ ہاں مکھن منگا لیتی ہوں۔"

"مکھن میں کیا میل نہیں ہوتا؟ ایلو مکھن میں تو بڑے مزے سے تیل ملا دیتے ہیں دودھ میں ہی ملا دیتے ہیں اور پتہ بھی نہیں چلتا ——— تم یہ کرو ———" اور وہ نہ جانے کیا ترکیبیں بتانے لگیں۔

برجو کا دم گھٹنے لگا۔ ماسی کو پرنام کر کے وہ کونے میں بیٹھی اپنی ساری کے پلّو سے کھیل رہی تھی اور ماس، آٹے دال کے بھاؤ سے تو اُس کا دل اور بھی گھبرا رہا تھا، وہ

کیوں آئی آخر؟۔

" مرچیں تو مہینے کے مہینے پسوا لیتی ہوں۔" بچپن کی بچھڑی دو سہیلیاں پھر وہی غیر دلچسپ باتیں کرنے لگیں۔ اگر شاما یا اختری ہوتی تو برجو کبھی بھی اُن سے اس قسم کی خشک گفتگو نہ کر سکتی۔ اور پھر جو ذرا کپڑوں کے متعلق گفتگو چھڑی تو برجو نے بھی دلچسپی کا اظہار کرنے کی ہمت کی۔ مگر اُس کا دل ٹوٹ گیا جب دریوں، جھاڑنوں، اور نواڑوں وغیرہ کا ذکر ہونے لگا۔ نیلی جارجٹ کی کِنّی دار ساڑھی اور شمیم کے آٹھے جمپر کی کسی نے بات بھی نہ پوچھی۔ وہ پھر اپنے ناخن سے ساڑھی کا پلّو کھرچنے لگی۔ مگر جب مٹکیوں اور صراحیوں کا ذکر آیا تو اُس کے گلے میں جیسے پھندا پڑنے لگا اور وہ بولا کر کھڑی ہو گئی۔ کسی نے بھی اُس کا نوٹس نہ لیا۔ چونکہ دونوں سہیلیاں بڑی سے بڑی مٹکی حیرت انگیز سستی قیمت پر خریدنے کا فخریہ قصّہ سنانے پر تیار تھیں۔ دونوں کے میکوں میں مفت سے بھی سستی صراحیاں ملتی تھیں اور اتفاق سے دونوں کی سسرالوں میں ٹھگ بڈّیا کھلے بندوں ہوتی تھی۔ پلنگ کی ادوانوں اور بان کے چھینکوں کا ذکر آدھا سنا ہی چھوڑ کر وہ برآمدے میں آگئی۔ باہر پڑوسن کے دو بچے کھڈیوں پر بیٹھے کوئی نہایت دلچسپ مسئلہ پر لڑ رہے تھے۔ دُور ایک گائے کھڑی کوڑا کھا رہی تھی۔ برجو الجھکر برآمدے میں رکھے ہوئے گملوں کو دیکھنے لگی۔ وہ ایک خوش رنگ پھول توڑ کر اُس نے اپنی لمبی چوٹی کے بالائی سرے میں اُڑس لئے اور نیچے کیاریوں میں سے دھنیے کی ننھی ننھی پتیاں توڑ کر سونگھنے لگی۔ بڑے سگھڑاپے میں آکر اُس نے منڈیر پر اُگی ہوئی بیکار گھاس کو نوچ کر الگ کر دیا اور چنبیلی کی مڑی ہوئی ڈالیوں کو سیدھا کرنے لگی۔

" برجو ـــــ او برجو" ایک کرخت آواز اُسے سنائی دی۔ وہ چونک پڑی۔

" ارے سنا نہیں۔ برجو وو" آواز اور بھی بھاری اور کرخت ہو گئی۔ وہ ڈر کر جلدی سے برآمدے میں آگئی۔

"برجو برجو ——— برجو ———" کوئی مکروہ آواز پکارے گئی۔ اس کا دل چاہا
جلدی سے ماں پاس بھاگ جائے۔ جہاں بس آٹے دال کا بھاؤ سُنتی رہے مگر آواز
اور بھی دھمکی آمیز اور ساتھ ساتھ امداد طلب نظر آئی۔ کیا وہ ڈرپوک تھی جو کچھ ڈر جاتی۔
نہ جانے کون جنگلی اُسے کیوں پکار رہا تھا۔ آواز پھر آئی اور کوٹھے پر سے آتی معلوم ہوئی۔

نہ جانے کیوں وہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگی ——— یقیناً وہاں کوئی اُسے پکار
رہا تھا۔ اماں تو نہ تھی ——— اتنی موٹی اور بھدّی آواز! اور بابوجی کا تو گمان بھی
——— خیر! وہ چڑھتی چلی گئی۔

"معلوم ہوتا ہے آج اس کی شامت آئی ہے۔ ارے برجو!" کسی نے سامنے سے
پکارا۔ اور وہ ڈر کو روندتی ہوئی دروازے تک آئی ——— !

سامنے میز کے پاس ایک کرسی پر ایک چوڑی سی برہنہ پیٹھ ایک قلم سے کھیلتی
ہوئی نظر آئی۔

"کہاں مر گیا تھا کمینے" پیٹھ کا مالک بغیر مُڑنے کے تکلیف اُٹھائے ڈانٹ کر
مخاطب ہوا۔ "خدا کی قسم ذرا یہ صفحہ ختم کر لوں تو ——— ہاں یہ تو بتا گیا کہاں تھا
——— کیوں رے کتے؟" قلم ویسے ہی ایک لمبے صفحے پر چلتا رہا اور سر جھکا رہا۔ برجو کو
ہنسی آئی اور تھوڑی دیر کو غصہ بھی، یہ کون گستاخ تھا جو اس بیہودگی سے اُس سے
خطاب کرنے کی جرأت کر رہا تھا۔ اُس کے بابوجی بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے اُسے ہمیشہ
"برجو بیٹے" ہی کہتے تھے ——— مگر یہ ———

"اب کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے کتے" چوڑی پیٹھ والے نے "کتے" پر زور دے کر
کہا "جا گلاس میں پانی لا"

برجو کا جی چاہا زور سے کھلکھلا دے اور غرور سے تن کر اُسے بتلائے کہ تم خود کتے
———

" اَب جاتا ہے کہ میں اُٹھوں ——" بغیر دیکھے اُٹھنے کی دھمکی دیتے ہوئے کہا گیا۔
برجو لوٹ آئی —— اُسے غصہ آ رہا تھا —— یقیناً پاگل تھا کوئی ——
پر ماسی کے گھر میں پاگل اور اُنہیں پتہ بھی نہیں۔ اُس نے سوچا جاکر حالات سے ماسی کو مطلع کرے۔ اور پھر کلیجے پر پتھر رکھکر آٹے دال کی قیمت پر بحث کر ہی ڈالے۔ مگر اس نے سیڑھیوں پر سنا " جو تو نے دیر کی تو سر توڑ دوں گا جوتوں کے مارے، سنا، ٹھنڈا پانی لاؤ"
اُس کی جوتی لاتی تھی پانی بد تمیز کے لئے —— گر نیچے جاکر اس نے صراحی سے پانی انڈیلا اور نہ جانے کیوں وہ دل میں ایک دلچسپ مہم کا خیال لیکر مسکراتی ہوئی چلی۔
اُس نے سیڑھیوں پر سے سنا " تو ہم کچل ڈالیں گے —— جب انتہا ہو جاتی —— جب .... ہوں —— ٹھیک۔ ہاں جب ظلم کی انتہا ہو جاتی ہے تو مظلوم ظالم کا گلا چبا ڈالتا ہے ......"
برجو کو ایک پھریری آئی اور اُس کا دل چاہا وہ فوراً لوٹ جائے " گلا چبا ڈالتا ہے " ارے!!۔
" برجو " —— ایک لمبی پکار پر اس نے زینے جلدی جلدی چڑھنا شروع کیا۔
" کیوں؟ کیا کنواں کھود رہا تھا —— ؟" قلم تیزی سے کچھ لکھ رہا تھا —— برجو چپ کھڑی رہی۔
" جس کام کو بھیجو مر کے رہ جاتا ہے ..... تو نے تو بس تھکا دیا۔ اور وہ خط ڈال آیا تھا —— ارے تیر —— میں پورا کر دوں گا اور بس تو نے دیر کی تو پھاڑ دوں گا سر تیرا۔"
برجو کا عجیب حال تھا، وہ چاہتی تھی ایک دم بھاگ جائے یہ معاملہ کیا ہے؟
" ابے کیا سر پر رکھے گا میرے —— رکھ دے نا یہ گلاس " ہاتھ نے قلم سے میز کا کونا کھٹکھٹا کر کہا۔

برجو نے گلاس رکھدیا اور لوٹنے لگی۔ مگر پھر رُکی! کیونکہ ——

"ٹھیر —— یہ چلا کہاں —— پھر وہی گلی ڈنڈا ...... ایک ملک ایک قوم ....
ہاں ابکے جو میں نے تجھے کلوا کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو بس —— یہی ایک علاج ہے ——
مگر ——"

برجو کا شبہ یقین کی حد تک پہونچ گیا۔ کوئی پولیٹکل پاگل ہے! دو لفظ پڑھتا ہے تو دو لفظ خود بخود بڑبڑانے لگتا ہے۔ اگر پگلی رنّو ہوتی تو برجو اس سے گڑ چنے مانگ کر پھیرتی۔ رحمان خاں ہوتے تو اُن سے مرغی کے انڈوں اور پتلی دال کا ذکر کرکے تنگ کرتی۔ وہ کوئی پاگل سے ڈرتی تھی —— مگر یہ عجیب و غریب پاگل! اس کا جی چاہا کہ ایکدم بھاگ کھڑی ہو۔ مگر جیسے کسی نے اس کے پیر پکڑ لئے۔

"ہاں - ذرا ٹھیر۔ میں پیکٹ بنا لوں —— گوند —— گوند کہاں گیا کمبخت! اوہ ——"

گوند میز پر ہی مل گیا۔ پھر سیٹی بجنے لگی اور گھٹنے ہلنے لگے۔ ناخونوں سے میز پر طبلہ بجا —— ساوریا من بھایا —— بے سُرے سُروں میں گایا گیا۔ برجو حیرت سے کھڑی سُلگتی رہی۔ اب اُسے ذرا اور ڈر لگا۔ اُس نے چاہا چپکے سے کھسک جائے۔ مگر.....

" اور ہاں۔ یہ تو میری کیاریوں میں کیا کر رہا تھا؟" برجو نے کیاریوں پر کوئی دست درازی تو کی نہیں۔ مگر پھر بھی وہ چونک اپڑی۔ اور اسے یقین ہو گیا کہ وہ دیکھ لی گئی ہے۔

"میں نے تجھے کتنی دفعہ منع کیا کہ تو میری کیاریوں سے دھنیا مت توڑا کر۔ مگر جب دیکھو چٹنیاں پیس پیس کر ٹھکس رہا ہے۔ ابکے میں نے تجھے کیاری کے پاس سے بھی گذرتے دیکھا تو ——"

قلم پھر تیزی سے چلا "یہ ختم کرلوں تو دوں —— جبتک تو مرغا بن —— سمجھا"

برجو کو مرغا بننا نہ آتا تھا۔ وہ بالکل نہ سمجھ سکی۔

اُس کو حیرت تھی کہ یہ کیسا پاگل ہے جو بولتا بھی جاتا ہے، لکھتا بھی جاتا ہے، اور سیٹی بھی وقتاً فوقتاً بجا دیتا ہے۔ وہ بھاگ کیوں نہ کھڑی ہوئی۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں لپک کر دبوچ نہ لے اور پھر ــــــ چبا ڈالتا ہے ــــــ " کچل ڈالیں گے ــــــ " کتنا عجیب پاگل ہے! ۔ وہ چپکے چپکے کھسکی! مگر پھر رُکی! ظالم پھر گرجا۔

" اور یہ میرے سفید پھول کس نے توڑے تھے ــــــ بول۔ اَبے جو تو نے پھول چھوا تو بس یاد ہی کرے گا۔ آخر تو میری کیاریوں سے بھٹرتا ہی کیوں ہے ؟" اور پھر سیٹی بجنے لگی۔

برجو کا مارے غصّہ کے مُنہ لال ہوگیا۔ وہ سدا اسے ماسی کے یہاں آتی تھی جتنے پھول جی میں آتا تھا توڑتی تھی۔ اور جو گملا پسند آتا لے جاتی۔ اور یہ آخر کون کمینہ تھا جو اُسے منع کرنے کی ہمت کر رہا تھا۔ اُسے شاید پتہ نہیں تھا کہ وہ کون ہے ــــــ لالہ کھیم چند کی اکلوتی بیٹی ــــــ اور ــــــ اور ــــــ برج رانی۔ جسے کبھی کسی نے ترچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ اُس کا خون کھول رہا تھا۔

" کہتا ہوں لان پر مت لوٹا کر ــــــ "

برجو نے صرف بیکار گھاس نوچی تھی!۔

لفافہ تیار ہوگیا۔ اور پیٹھ مُڑی۔ برجو ذرا دور کھسکی۔ وہ پچھتانے لگی۔ آخر دال آٹے کے بھاؤ میں ایسا کیا عیب تھا جو بیں اس کا ذکر بھی نہ سن سکی اور اس مصیبت میں پھنسنے کو آ گئی۔

ایک بات! تُو نے میرے موزے دھو دیئے " لفافہ پر پتہ لکھا گیا۔ برجو اور مُوزے دھوئے!۔

" بولتا کیوں نہیں ــــــ کیوں رے کُتّے!! "

اور چوڑی پیٹھ دیوار کی طرف چلی گئی ـــــ اور ـــــ گھنے بالوں والا سر گھوما۔

"ارے.... آپ.... آ.... آ.... میں" لفافہ جان کر گرا یا گیا اور پھر اٹھا لیا گیا۔

دو ایک عجیب گھبرائی ہوئی حرکتیں سرزد ہوئیں ـــــ

"میں ـــــ برجو ـــــ وہ جانے کہاں گیا ـــــ" بے ضرورت سر کھجایا گیا۔

دروازہ کھلا اور بوکھلائی شکل کا ایک میلا سا چھوکرا ہتھیلی میں کچھ لئے ذرا ہانپتا ہوا آیا۔ برجو نے اطمینان سے ایک لمبی سانس لی اور دو انچ لمبی کھنچ گئی۔

"اوہ ـــــ" برجو کچھ کھسیانی اور بہت کچھ سٹپٹاتی لوٹ پڑی۔ سیڑھیوں پر نیچے اترتے وقت وہ پھر چونکی۔

"کیوں بے برجو اب لوٹا ہے تو جب کا گیا؟ ـــــ چل اب سیدھی طرح ـــــ بن مرغا ـــــ گھنٹہ بھر ـــــ" تڑ سے تھپڑ کا پٹاخہ سنائی دیا ـــــ "کیوں رے کتے؟"

برجو ماسی کے قریب بیٹھ کر پھر ساری کے پلو سے کھیلنے لگی۔

"اور بہن میں نے جو اچار ڈالا تھا سو بھی ساری پھپوندی لگ گئی" برجو کی ماں بے تکان کہہ رہی تھی!

# بن بلایا مہمان

کہتے ہیں اونگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ، ہم ہندوستانی ایسے جنگجو واقع ہوئے ہیں کہ بس بات بے بات جو تم بیزار ۔مسجد کے سامنے کافروں نے ڈھول پیٹے مسلمانوں نے ڈھول پیٹنے والوں کو پیٹ ڈالا۔ مندر کے آگے سے تعزیئے نکلے اور لٹھ چلا۔ دراصل ہم لوگ حساس بہت واقع ہوئے ہیں ـــــ!

پیپل کا ایک شریر گدا عین سڑک پر جھک آیا اور جب قد آور تعزیوں نے اُدھر سے چہل قدمی کی کوشش کی تو جھکنے کی ضرورت پڑی۔ تعزیئے اور جھکیں! اور گدا

وہ بھی پیپل کا! توبہ کیجئے اسی طرح ڈٹا رہا۔ نتیجہ؟ سینکڑوں گھر لُٹ گئے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھر پھونک دیئے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کو کاٹ کے رکھدیا۔ یہ تو لمبی داستان ہے، مگر ہم میں سے کون ایسا ہے جس کے لئے یہ نئی بات ہے۔ ہمارے پردادا کے وقت سے لیکر اب تک تعزیوں اور پیپل کے گُڈوں کا خاندانی بیر چلا آتا ہے اور خدا نہ کرے جو ہم اپنی قومی خوبیوں کو خیرباد کہیں۔ اور جب مسلمانوں نے گڈا کاٹا تو اندازہ لگا لیجئے کیا ہوا۔

اور جب ہندو مسلمان لڑ رہے ہوں تو برجو ماسی جی کو دیکھنے کیسے جائے۔ گلی میں جب "لیجیو چلیو" کا غل مچتا تو برجو کمینہ مسلمنٹوں کو اُن کے مظالم سے باز رکھنے کے لئے تلسی کے پیڑ کے آگے دونوں وقت ہاتھ جوڑ کر ہاتھا ٹیکتی ——— مگر اِن کمبختوں نے تلسی کے گملے کو بھی توڑ ہاتھا پائی اور دھکا پیل میں کچل کر رکھ دیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے غول بیابانی بڑے پھاٹک کو پھاند کر آن پہونچا تھا۔

رات کو وہ اپنے کمرے میں آنے سے پہلے ماں سے لپٹ کر اطمینان کر لیتی کہ گھر میں پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا۔ اور اُس کے کمرہ کے پاس ہی گورکھوں کو تعینات کر دیا گیا ہے۔ ہر کوئی رات کے گیارہ بجے۔ جبکہ وہ خواب میں پھٹے کپڑوں والے زخمیوں کو گلیوں میں گرتا پڑتا دیکھ رہی تھی ایک دم اُس کی آنکھ ایک غیر معمولی کھٹکے سے کھل گئی اور ایک بھیانک سایہ دُھندلکے میں کھڑکی میں سے داخل ہوتے دیکھ کر اس کی گھگّی بندھ گئی۔ اس سے قبل کہ اس کی چلانے کی طاقت عود کر آئے وہ بھیانک سایہ اسکے اوپر جھک کر عجب طرح غرّایا کہ وہ سہم گئی۔

"خبردار جو......" برجو بستر میں دبک گئی۔ نیچے بے طرح غل مچ رہا تھا۔ شاید کوئی شکار گلی والوں کے ہاتھ سے چھوٹ کر اُس کے کمرہ میں پناہ لینے آیا تھا...... لیکن ——— اگر وہ اُسے قتل کرنے آیا تھا تو؟ وہ پھر چیخنے لگی۔ سائے نے فوراً اپنے

کھُردرے سخت ہاتھوں سے اُس کا مُنہ بھینچ دیا۔
" تم چیخو گی تو ـــــ میں تمہارا گلا دبا ڈالوں گا ـــــ سمجھیں ـــــ وہ مجھے مارنے آرہے ہیں ـــــ مار ڈالیں گے ـــــ کمینے " اُس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ اور گرفت ڈھیلی کر دی۔
بر جو بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔
" تم بڑی ڈرپوک ہو " مخاطب کے لہجہ میں ہنسی کا شائبہ تھا۔
" تم ـــــ ہو کون ؟ "
" میں کوئی بھی ہوں .... وہ لوگ مجھے مارنے آرہے ہیں .... خدا کی پناہ .... شاید اُنھوں نے مجھے آتے دیکھ لیا " اُس نے ذرا اُٹھتے ہوئے کہا۔ گلی میں غل سُنائی دے رہا تھا۔
اندھیرے میں اُسے بولنے والے کا نقشہ تو نظر نہ آیا ـــــ مگر " خدا کی پناہ ! " سے وہ پہچان گئی کہ کوئی مسلمان ہے ـــــ بعض وقت خدا کا نام لینا بھی آفت میں پھنسا دیتا ہے۔
" تم نکل جاؤ میرے کمرے سے .... ابھی .... " وہ پیچھے کھسک کر اُٹھنے لگی۔
" ابھی ؟ " اُس نے حیرت سے کہا " اِس ـــــ حالت میں ـــــ توبہ کرو وہ مجھے .... "
" ہاں اِس حالت میں ـــــ " بر جو اُسے ذرا دبتا دیکھ کر بہادر بنی۔
" خوب ! " اِس مصیبت میں بھی اُسے خوش مذاقی سوجھ رہی تھی " اور جو وہ مجھے کُتّے کی موت مار دیں تو پھر ـــــ آپ ـــــ آپ کا کیا جائے گا "
" میں ـــــ میں " وہ شاید کسی کو پکارنے کی دھمکی دینے والی تھی۔
" اگر آپ چلائیں تو مجھے مجبوراً آپ کے نازک گلے کو اپنے کریہہ ہاتھوں سے گھونٹنا

پڑے گا۔ میں کہتا ہوں آپ ڈرتی کیوں ہیں۔ میں کوئی ہوّا تو نہیں ہوں جو آپکو کھا جاؤں گا۔ چپکی پڑی رہیئے۔"

"آپکو اس طرح میرے کمرہ میں آنے کا کیا کوئی ——"

"بالکل نہیں —— قطعی نہیں۔ مگر سنیئے تو —— میرے پیچھے چار ڈاکو کوئی سو ڈیڑھ سو کے قریب لفنگے لگے ہوئے ہیں —— نہ جانے کیسے کیسے گھنٹہ بھر سے بھاگم بھاگ یہاں تک آیا ہوں اور مجبوراً مجھے آپ کے دولت خانہ میں بغیر اجازت کے گھسنا پڑا —— یقین مانیئے مجھے رات کے بارہ بجے آپ جیسی حسین چھوکریوں کے کمروں میں گھسنے کی قطعی عادت نہیں —— ہاں —— اور میں ذرا دیکھوں تو آپ —— کہاں ہے آپکا —— وہ آپ کی بجلی —— ذرا جلائیے تو ——"

"بالکل نہیں۔ آپ نکل جائیے یہاں سے ورنہ ——" برجو نے ذرا تن کر کہا۔

"ورنہ؟ —— ورنہ کیا؟" آنے والے نے بجلی کے بٹن کو تلاش کرنا شروع کیا۔

"ورنہ یہ کہ میں ابھی ...."

"کسی کو بلا لیں گی! یہی نا؟"

"ہاں"

"پھر؟"

"پھر ... پھر ... تم ..."

"کتے کی طرح آپکے کمرے میں ذبح کر دیا جاؤں گا"

میز پر رکھے ہوئے لیمپ کو روشن کرنے پر برجو کی حیرت کی انتہا نہ رہی "کیوں بے کتے؟" اُس کے دماغ میں گونجنے لگا۔ ماسی کے گھر والا دیوانہ انسان خون اور

کیچڑ میں لتھڑا، چیتھڑوں میں ملبوس، ہاتھ میں ایک حقیر سی چھڑی لئے لیمپ کی روشنی سے گھبرائی ہوئی آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ رشید اُس کی ماسی کا بیٹا۔ وہ کچھ متحیر اور کچھ خوف زدہ اپنے کو ساڑی میں لپیٹتی ہوئی پلنگ کے دوسری طرف کھڑی ہو گئی۔

"کیا آپ پسند کریں گی کہ آپ اس وقت باہر گلی میں چلی جائیں" اُس نے شاید برجو کو نہ پہچانتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ میرے کمرے میں رہیں"

"اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنی بوٹیاں نچوانے باہر چلا جاؤں"

"آپ بڑے بُزدل ہیں؟"

"ہیں ہیں؟ مگر ذرا سوچئے تو ———— میں نے ———— مَیں کس طرح اتنے درندوں سے لڑ سکتا ہوں"

"میں کیا جانوں"

"لیجئے وہ ———— شاید وہ پھر آ گئے" شکاری نے احاطہ میں غل سُن کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اور دروازہ بند کر دیا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" برجو نے گھبرا کر کہا۔

"شاید دروازہ بند کر رہا ہوں" اسکے لہجہ میں ایک تلخ تبسم جھلک رہا تھا "اور پھر......"

"میں ——— آپ کو ابھی اُن کے حوالے کر دوں گی" برجو نے جھلا کر کہا۔ اور دروازے کی طرف بڑھی۔

"کیا آپنے فیصلہ کر لیا کہ مجھے مرجانا چاہئے" بن بلائے مہمان نے ذرا طنز سے کہا۔

"یہ میں نہیں جانتی" برجو نے ذرا تکلف سے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے — میں یہیں مروں گا؟" اور وہ کرسی پر ڈٹ کر بیٹھ گیا۔
برجو ٹھٹکی "تمہیں باہر جانا پڑے گا۔" اُس نے رعب سے کہا۔
"مرنے کے لیئے نا؟ خوب! — جی نہیں میں یہیں اسی جگہ مروں گا — تاکہ آپ دیکھیں کس طرح میری گردن میں سے خون کے شراٹے نکلتے ہیں۔ جبھی جہاں میرا دل چاہے گا وہیں مروں گا۔ نہ کہ آپکے حکم کے مطابق۔"
برجو نے پھریری لی۔
"اور تازہ تازہ خون! لال لال! یہاں بہے گا" اُس نے اپنے چاروں طرف اشارہ کیا۔
"مگر —" برجو لوٹ پڑی۔
"اگر نا مگر — اور پھر میں بھوت بنکر آپ کو — آپ کو — بس سمجھ لیجئے خوب! —"
"آپ کمرے سے چلے جائیے" برجو کچھ لاچار سی ہوگئی۔
"جی نہیں — ابتو آپ دیکھیں — آپنے کبھی بکرے کٹتے دیکھے ہیں — کچھا کچھ گوشت کا قیمہ بنتے ہڈیوں کا چورا ہوتے دیکھا ہے" کمزوری سے فائدہ اُٹھایا گیا۔
برجو نے دو ایک دفعہ قصائی کی دکان دیکھی تھی۔ اسکے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔
"اور میرا سر وہ لوگ اینٹوں سے پھوڑیں گے — میرا بھیجا یہاں — اور کیا عجب جو یہ سب آپ کی خوبصورت چیزیں میرے خون سے لتھڑ جائیں۔ بہتر ہو کہ ذرا آپ اپنا سامان وغیرہ کھسکا لیں۔ کیونکہ وہ لوگ مجھے آسانی سے ذبح نہ کرسکیں گے۔ وہ گھمسان کی لڑائی ہوگی — یاد رکھیئے — آپ مجھے بُزدل کہتی ہیں۔ چار کو مار کے مروں گا۔"
"آپ — بڑے عجیب آدمی ہیں" برجو مجبور ہوکر مڑی۔
"کیا سمجھتی ہیں آپ؟ — سمجھا کیا تھا آپنے مجھے —" اکڑ کر سینہ تانتے ہوئے

کہا گیا۔ "دیکھئے گا آپ خون کا دریا بہہ جائے گا۔ بس خون ہی خون! چھ سات لاشیں گر گئیں ——" احاطے میں غل کو بڑھتے دیکھ کر عجیب و غریب پاگل بولا۔

برجو دروازے کے قریب گئی تو اُسے زور زور سے بولنے کی آوازیں سُنائی دیں۔ بلوائی شاید شکار کو نوکروں کے حصہ میں ڈھونڈھنے کے بعد خاص مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گورکھے اتنے بڑے انبوہ کو سنبھالنے میں ذرا مشکلات محسوس کر رہے تھے۔

" وہ مکان میں تلاشی لینے آ رہے ہیں۔" برجو نے گھبرا کر کہا۔ تھوڑی دیر کے لئے اُس بیفکر انسان کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

" آپ کو مجھے چھپانا ہوگا۔" اُس نے برجو پر دباؤ ڈالا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

" میں کہیں آپ کو نہیں چھپاؤں گی۔" برجو غصہ سے تن گئی۔

" جلدی کرو ——" اور اُس نے برجو کے کندھے جھنجھوڑ ڈالے "تمہیں معلوم نہیں —— میں مرنا پسند نہیں کرتا۔"

" تم کمینے ہو۔" وہ جھٹکے سے دور کھڑی ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ غیر فیصلہ کن انداز میں کھڑا رہا۔ برجو نے اُسے غور سے دیکھا۔ اُس کے جسم اور چہرہ پر کیچڑ لگی ہوئی تھی۔ گریبان نیچے تک پھٹا ہوا تھا اور ایک ٹانگ بالکل برہنہ تھی۔ باوجود سردی کے وہ پسینہ میں نہایا ہوا تھا۔ پریشان بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اگر وہ اتنا گندہ نہ ہوتا تو اچھی خاصی شکل تھی۔

" تم واقعی چاہتی ہو کہ میں مارا جاؤں ۔۔۔ ذرا سوچو اگر تمہارا اکلوتا بیٹا اس طرح بلا میں پھنس جاتا تو تم کیا اُسے اِن درندوں کو دیدیتیں تاکہ وہ اس کی بوٹیاں چبا ڈالیں ——" اُسے دروازہ کی طرف کوئی آتا معلوم ہوا۔ لپک کر اُس نے بجلی بجھا دی اور مضبوطی سے برجو کے کندھے گرفت میں لے لئے۔

" اگر تم بولیں تو میں ـــــ" اس نے خوفناک طریقے پر دانت بھینچ کر کہا " تمہیں بھی میرے ساتھ مرنا ہوگا ـــــ سمجھیں "
" اچھا ـــــ اس پردے کے پیچھے چھپ جاؤ ـــــ" برجو مجبور ہو کر بولی۔ وہ خون خنجر کے خیال سے لرز گئی۔ آنے والے نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔
" بی بی " کسی نے ڈری ہوئی آواز سے پکارا۔
" بالکل خاموش !" گھٹی ہوئی تاریکی میں برجو نے سنا اور کندھوں کی گرفت مضبوط ہو تی گئی۔
" چھپ جاؤ ـــــ پرماتما کے لئے چھپ جاؤ " اس نے اجنبی دیوانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔
" بی بی ـــــ لوگ آرہے ہیں ـــــ" اور ساتھ ساتھ غل بالکل برآمدے میں سنائی دیا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ انہوں نے ایک آدمی اسی سمت آتے دیکھا تھا۔
" چلو ـــــ میں تمہیں ادھر چھپا دوں گی " لیکن جیسے وہ کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ کیونکہ وہ بت کی طرح کھڑا رہا۔
" چلئے " اس نے ذرا التجا آمیز طریقے پر اسے ڈھکیلا۔
" نہیں ـــــ تم کہتی ہو میں بزدل ہوں ـــــ میں تمہیں دکھاؤنگا ـــــ ذرا دروازہ کھولدو ـــــ" وہ دروازہ کی طرف بڑھا۔
" نہیں ـــــ یہ کیا کرتے ہو وہ تمہیں مار ڈالیں گے "
" بلا سے " اور وہ اسے ڈھکیلتا آگے بڑھا۔
" دیا کیجئے ـــــ پرماتما کے نام پہ " وہ اسے روک کر بولی۔
" کیوں ؟"
" میں خون نہیں دیکھ سکتی "

"ہوں بڑی خود غرض ہیں آپ! اچھا آپ چلی جائیے —— اور مجھے ——"

"نہیں، میں آپ کو مرنے نہیں دونگی۔ جلدی کیجئے۔ وہ لوگ ڈرائنگ روم میں بھی ڈھونڈ چکے۔ اب اِدھر ہی آرہے ہیں۔"

"میں نے کہہ دیا کہ میں دکھا دوں گا آپ کو۔ یقیناً خوش ہو جائیں گی آپ —— ہاہا" —— وہ بیدردی سے ہنسا۔

"میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں" برجو سسکیاں بھرنے لگی۔

"یہ خوب زبردستی ہے!" اُس نے روٹھے ہوئے بچے کی طرح کہا۔ اور برجو اُسے گھسیٹتی ہوئی پردے کے پیچھے لے گئی۔

"خاموش، اگر آپ ذرا ہلے تو وہ دیکھ لیں" اُس نے اُسکے کان کے قریب کہا۔ پردہ برابر کرکے اُس نے لیمپ جلایا اور جلدی جلدی اُس نے وہ کیچڑ اور مٹی جھاڑ دی جو کہ فرش اور قالین پر لگ گئی تھی —— جلدی سے کھڑکی بھی بند کر دی اور ایک گلدان اور چند کتابیں اُٹھا کر وہاں رکھ دیں۔ تاکہ کوئی سمجھے کہ کھڑکی کھلی ہی نہ تھی۔

"کون ہے" اُس نے دروازہ کھولا۔

دروازہ پر اُس کی آیا کھڑی کانپ رہی تھی اور اس کے پیچھے اُس کی ماں دوڑتی آتی دکھائی دی۔

"بی بی وہ لٹیرے آگئے —— ناس جائے ان کا۔ کہتے ہیں کوئی مسلمان آپکے کمرے میں آگیا ہے"

"میرے کمرے میں؟" برجو تن کر بولی۔

"ہاں۔ اُنہوں نے اُسے دیوار پر چڑھتے دیکھا —— اور —— اے لو وہ آ بھی گئے —— آگ لگ جائے اُن کو" ماں اُنہیں کوسنے لگی۔

تھوڑی دیر میں یہ معلوم ہوا کہ برآمدہ انہیں کناری بازار سے اور دوشیوں

کی سی ہیئت کی چند محظ زدہ شکلیں دروازہ میں نظر آئیں۔

"کیا ہے؟" ایک مہارانی کی سی شان سے برجو آگے بڑھی۔

"کچھ نہیں ـــــ شریمتی جی ایک پلچھا آپکے کمرہ میں ہمنے آتے دیکھا ہے"

"میرے کمرے میں؟" برجو نے حیرت سے انہیں داخل ہونے کا راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں" اور بہت سی عجیب عجیب شکلیں آگے آئیں۔ لیکن ایک ہی لمحے میں انہیں سوائے چند مسحور کن اشیا کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ وہ لوگ حیرت سے ان عجیب وغریب کرسیوں اور میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو گھورنے لگے۔ تھوڑی دیر کے لئے شکار کو بھول گئے۔ جو شاید غور سے سنتے تو سانس کی آواز سن لیتے۔

"یہاں کون آتا" برجو نے دل میں لرزتے ہوئے کہا۔

"یہاں کون آتا" ان میں سے شاید ان کا لیڈر بولا۔

"کوئی بھی نہیں" سیٹھانی نے اطمینان سے کہا۔

ذرا ناامید ہو کر جاتے ہوئے بلوائی یقین دلا گئے کہ وہ محض قومی ہمدردی سے مجبور ہو کر ایک ڈشٹ سے انہیں بچانے آئے تھے۔

اس کی ماں بے طرح گھبرائی ہوئی تھی اور اسے مجبور کیا کہ وہ چل کر اسکے پاس سوئے یا کم از کم اپنی آیا کو تو پاس سلا ہی لے ـــــ!"

برجو نے ہنس کر اسے یقین دلایا کہ وہ قطعی نہیں ڈر رہی ہے۔ ڈرنے کی ایسی بات ہی کیا تھی۔ وہی لوگ تھے ـــــ اس نے اپنے حسین کمرے میں آیا کی گودڑی آنے کے تصور کا مذاق اڑا کر بہانا بنا دیا۔ آیا اسے گذرے زمانے کی باتیں یاد دلا کر رعب جمانے لگی جب برجو ننھی سی تھی اور اسی گودڑی میں کس مزے سے سوتی تھی۔

"اب میں بڑی ہو گئی ہوں" وہ ہنسی۔

دروازہ بند کر لینے کی سخت تاکید کر کے اور "وحشتوں" سے بچے رہنے کی دعا دیتی ہوئی بھولی بھالی بڑھیوں کے جانے کے بعد برجو پردے کی طرف مخاطب ہوئی۔ جس کے بیچ میں ایک مسخرہ چہرہ مسکرا رہا تھا۔

"اب تم فوراً چلے جاؤ" اُس نے اپنی پہلی سختی سے کہا۔

"ہوں!" اور وہ نہایت اطمینان سے آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"سنا نہیں؟ اب جانا چاہیئے تمہیں"

"اوہ ذرا ——"

"نہیں اب تم ایک منٹ بھی نہیں ٹھیر سکتے"

"نہیں جاتا میں بُلا لو اُن جنگلیوں کو۔ تم سے تو وہی بہتر تھے" اس نے بات جھلانا شروع کیا۔

"تمہیں بات کرنا نہیں آتی"

"اور تمہیں کونسی بات کرنا آتی ہے۔ ایک پٹے پٹائے بھوکے پیاسے انسان سے یہی سلوک کیا جاتا ہے؟"

"اوہ —— اچھا مگر اسوقت تو تمہیں بھوکا ہی جانا ہوگا"

"تو بُلا لو اُنہیں .... بہتر ہے وہ مجھے مار ڈالیں" اُس نے غصے سے دانت پیس کر کہا "یہ نہیں دیکھتیں ——" اُس نے اپنی کہنیاں اور خون آلود گھٹنے دکھا کر کہا۔

"مجھے بڑا افسوس ہے" وہ پانی لینے چلی۔

"اور کیا، ہونا ہی چاہیئے" اُس نے بڑ بڑانا شروع کیا۔

لوٹا برجو کے ہاتھ سے لیکر پہلے تو اُسے پی کر بالکل خالی کر دیا اور پھر اور مانگا۔

"کبھی کسی نے تمہیں لڑکیوں سے بات کرنا نہیں سکھایا۔ اِدھر لاؤ اپنا بازو" برجو نے کپڑے میں سے زائد پانی نچوڑ کر بزرگانہ لہجے سے کہا۔ مگر اُسے ترس آرہا تھا۔

" ہونہہ ـــــ کوئی کیا بات کرنا سیکھے ـــــ تم لوگ خواہ کیسی ہی بہادر رہو جہاں کوئی اجنبی آیا اور تم لوگ نئے تیتر کی طرح بھڑکیں۔ کہو بھلا میں خود مصیبت میں گرفتار رہوں تمہیں کیا نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ مگر نہیں ـــــ تم خود ہی پرانے دستور پر چلوگی۔ اور ہم لوگ جان نہ پہچان جہاں کسی لڑکی کو مصیبت میں دیکھا اور اپنی جان ہتیلی پر رکھ کر پہونچے۔ اگر تم اسوقت اِس طرح گھر جاتیں تو یقین مانو جان دینے میں بھی مجھے عُذر نہ ہوتا۔ مگر تم ....."

" دُکھتا تو نہیں ؟ " برجو نے بات بدلنے کے لئے زخم کو کپڑے سے چھو کر پوچھا۔

" قطعی نہیں ربڑ کا بنا ہوا ہوں "

برجو ہنسنے لگی۔

" اب تو جانے میں کوئی عُذر نہیں ؟ " خون پوچھنے کے بعد کہا۔

" اس طرح ؟ " اُس نے اپنے چیتھڑوں کی طرف غصہ سے دیکھ کر کہا۔

" تو میری ساڑھی اور جمپر پہن جاؤ " وہ بستر پر بیٹھ کر ہنسنے لگی۔

" تمہیں کسی نے لڑکوں سے بات کرنا نہیں سکھایا " اُس نے طعن سے دُہرایا۔

اور تھوڑی دیر بعد وہ برجو کی سفید ساڑھی کو آدھا اوڑھے اور آدھا لپیٹے جانے کیلئے تیار ہو گیا اور کھڑکی کھولنے لگا۔

" ادھر سے ؟ "

" اور نہیں تو پھر کدھر سے۔ تم سمجھتی ہو میں تمہارے گھر کے کونے کونے سے واقف ہوں " اُس نے نہایت بُرا مان کر کہا۔

" پھاٹک سے نکل جاؤ "

" گو دیکھے ! "

دونوں سوچ میں پڑ گئے۔

" ماں کو خبر دینی ہوگی "

" تم جانو ——— دیکھو مارا گیا تو ——— "

" چُپ رہو "

" مگر سنو تو ——— ادھر تو کوئی دکھائی نہیں دیتا " اُس نے کھڑکی کھول کر جھانکتے ہوئے کہا۔

اور دوسرے لمحے وہ سُنسان گلیوں میں سمٹتا بچتا چلا جا رہا تھا۔

# بچہ

فساد بڑھتا گیا۔ گورنمنٹ نے دونوں پارٹی کے ممبروں کو بغیر تحقیق جیل میں ٹھونسنا شروع کیا۔ مارنے والا اور پٹنے والا دونوں گئے۔

اُسی ہنگامہ میں رشید کو پھر اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے نکلنا پڑا۔ شہر کے گلی کوچوں میں معلوم ہوتا تھا سینما کے سین دکھا رہے جا رہے ہیں۔ سنسان گلی میں ایک دم بھگدڑ پڑ جاتی تھی۔ اور پھر وہی موت کی سی خاموشی۔ جھگڑے فساد کے درمیان میں ہی رشید ایک ننھے سے ننگے دھڑنگے بچے کو بلوائیوں کے پیروں سے کچلنے سے بچا کر ادھر اُدھر سے بچتا اپنے گھر پہونچا تو ایک اور ہی مصیبت آن پڑی۔ ایک تو ماں بیمار اور پرسے بچہ کا پالنا۔ نوکر بلوے کے سلسلہ میں نہ جانے کہاں اُڑے ہوئے تھے۔ گھر پر ایک تباہی چھا گئی تھی۔ جھاڑو دینے اور کھانا پکانے اور ماں کی تیمارداری کرنے میں رشید کا دماغ لوٹا جاتا تھا اور جب سے بچہ آیا تھا اُس کے اور بھی حواس گم تھے۔ اُسے نہلانے دُھلانے میں اسے قیامت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بچہ صرف گھٹنیوں چلتا تھا۔ اور کچھ کھا بھی نہ سکتا تھا۔ وہ چار چار دفعہ بچے کو بالکل ایک گلاس کی طرح کھنگال ڈالتا اور پھر بھی میلا ہی رہتا۔ نہلانے میں نہ جانے کتنی دفعہ صابن ہاتھ سے پھسلتا۔ کتنی دفعہ بچہ لوٹا اوندھا دیتا اور کتنی ہی مرتبہ خود بچہ ہاتھ سے

پھسلکر موری میں جا پڑتا۔

اور پھر اُسے کپڑے پہنانا! ـــــ خدا کی پناہ ـــــ رشید نے اپنے سارے بنیان اُسے پہنا ڈالے۔ پھر تکیے کے غلافوں کی باری آئی اور آخر میں اُس نے اُسے چیتھڑے پہنا کر اوپر سے دھجیوں کی مدد سے ایک کرتے کی شکل میں جسم پر باندھ دیا۔ اس کے کمرے میں میلے اور گیلے کپڑوں کے انبار میں بچہ کھیلا کرتا۔ وہ بےچین تھا کہ کب بلوہ ختم ہو اور وہ اس فتنہ کو اس کے ماں باپ تک پہنچا دے۔ مگر ایک بات ہے کہ اُس کی خشک کتابوں کی زندگی میں بچے نے ایک دلچسپ ہلچل مچا دی اور اس کا کام کرنے میں اُسے گونہ دلچسپی ہوتی تھی۔ وہ گھنٹوں اُسکے ساتھ اُلٹی سیدھی حرکتیں کرتا اور بچہ بھی بہت مانوس ہو گیا تھا۔ کبھی وہ اُس سے نہایت سنجیدگی سے کھانا پکانے اور اس رات کے واقعہ پر یک طرفہ بحث کیا کرتا تھا۔

---

بلوہ دب گیا اور گلی کوچے گذرنے کے قابل ہو گئے گو سینکڑوں گھر لُٹ گئے اور یتیموں کی تعداد دُگنی ہو گئی۔

رشید نے بچے کو کسی یتیم خانہ میں دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کیونکہ وہ اُسے سڑک پر لیکر "پانی چیز پرائی چیز" کے نعرے تو لگا نہیں سکتا تھا۔ اُسے کچھ افسوس سا ہوا جب وہ بچہ کو ایک تولیہ میں لپیٹ کر یتیم خانہ لے گیا۔

" اِس کے ماں باپ کون تھے ؟" مہتمم یتیم خانہ نے پوچھا اور رشید کی لاعلمی ظاہر کرنے پر صاف کہدیا کہ " جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ یہ بچہ کسی ہندو کا ہے ہم اسے ہندو یتیم خانہ میں نہیں رکھ سکتے۔ ویسے ہی شہر میں بلوہ ہو چکا ہے اور ابھی ہندو مسلمان کسی طرح بھی ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں۔"

رشید کو غصہ تو آیا لیکن اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اُسے کسی مسلم یتیم خانہ میں لے آئے۔ مگر اس کی حیرت اور غصہ کی انتہا نہ رہی جب ان لوگوں نے [illegible]

گروہ کا نمائندہ بتا کر کہہ دیا کہ وہ اِن چالوں میں نہیں آئیں گے۔ یتیم خانوں کا معاملہ ہے، اگر پھر بلوہ ہو گیا تو یہ معصوم بھی پھنس جائیں گے۔

رشید گھبرا کر بے جواب دیئے باہر نکل آیا اور اُس نے بچے کو لیکر ایک طرف چلنا شروع کیا۔

"اچھا مسٹر اب صاف صاف بتا دو کہ تم ہو کون بلا؟" اُس نے بچے کو پُل کی منڈیر پر بٹھا کر پوچھا۔

بچے نے ہنس کر ایک تھپڑ مار دیا۔

"ارے ــــــ میں کہتا ہوں مولانا یہ مذاق کا وقت نہیں۔ بہتر ہے آپ سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور فرمائیں اور صاف صاف اپنی ولدیت، مذہب اور ذات پات سے خاکسار کو آگاہ کریں۔" اس نے سنجیدگی سے تھپڑ کی زد سے بچ کر کہا۔

"غوں ــــــ اُوں" بچہ ہنستا رہا اور اُس کے بٹن کو دانتوں سے پکڑنے کے لئے زور لگانے لگا۔

"اوہ ــــــ آپ نہیں سمجھتے؟" اور وہ بچے کو اُٹھا کر چلنے لگا۔ یہ تو ناممکن تھا کہ وہ بچے کو خود پالنا شروع کر دے۔ گو اب نوکری بھی واپس آ گیا تھا۔

وہ دیر تک چلتا رہا۔

"کیوں نہ جس کا مال ہو اُسے ہی دے دیا جائے" اس نے بچے کو سڑک کے کنارے بٹھانے کا ارادہ کیا۔ مگر وہ اُترنے پر تیار نہ ہوا۔ رشید کو یقین تھا کہ اگر وہ اس طرح بچے سے پیچھا چھڑا پا جائے تو اُسے کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لے جائیگا۔ اُس نے بہلا پھسلا کر سگریٹ کا ڈبہ اور کاغذ وغیرہ دیکر ایک سنسان سڑک کے کنارے بٹھا دیا۔

اور خود آہستہ آہستہ آگے چلا۔

"ڈاڈا" بچہ بولا۔ اس کے پاؤں رکے، پھر بڑھا ــــــ بچے نے منہ بسورا۔

" حضرت میں آپ سے ڈرتا نہیں " اور وہ دو قدم اور بڑھا۔
" ہا ہا " بچّہ رونے لگا۔ رشیدؔ کے قدم کسی نے دو سکنڈ کے لئے روکے ——— مگر وہ پھر بھی چلتا گیا۔ اُس نے بچے کے رونے کی آواز سے بچنے کے لئے دونوں کان بند کر لئے اور لمبے لمبے ڈگ مارتا چلا ——— بچّہ اب بھی رو رہا تھا۔ رشید رُکا ——— واپس مُڑا پھر چل دیا ——— پھر مُڑا۔ اور تھوڑی دیر رُکنے کے بعد وہ پھر چل دیا ——— مگر اب بھی اس سمت جدھر سے بچے کی رحم طلب معصوم آواز آرہی تھی۔
رشید نے غصّہ ہو کر اُسے اُٹھا لیا۔ تھوڑی دیر غور سے اُسے گھورا۔ بچّہ پھر بسورا۔ رشید خاموش چلنے لگا۔ بچّہ اُسے تھوڑی دیر ایسے دیکھتا رہا۔ جیسے روٹھی ہوئی ماں کو دیکھتا ہے۔ پھر ننّھا سا ہاتھ ہوا میں اُٹھا اور پورے زناٹے سے رشید کی کنپٹی پر پڑا۔
" بڑے بدمذاق ہیں آپ " رشید نے ہنسی روک کر کہا۔
دوسرا تھپّڑ۔
" اچھا ——— اچھا معاف کریئے " اُس نے بچّہ کو کلیجہ سے لگا کر کہا۔

---

پھر وہی بچّہ اور وہی بیماریاں اور گھرا۔ لیکن اب وہ اتنا سُونا نہ نظر آتا تھا۔ وہاں ہر وقت ایک بچے کی کلکاریاں اور ایک نیم پاگل انسان کے قہقہے گونجا کرتے۔ رشید نے اُسے پولیس کے سپرد کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مگر وہ انتظار کر رہا تھا۔ نہ جانے کس کا ؟ ۔ جب پولیس کو دینا ہی ہے تو پھر دو دن گیا اور چار دن گیا؟ اور دوسرے اُسے بچے کو دینے کے لئے کوئی نہایت موزوں وقت بھی تو نہیں ملتا تھا۔

---

پھر ایک دن بِرجو اپنی ماں کے ساتھ آئی تو اُسے بچّہ بڑا دلچسپ نظر آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایسے تکنے لگے گویا کبھی پہلے ملے ہی نہیں ہیں۔ بِرجو نے پہلے تو

بچّے کے بے ڈھنگے کپڑوں کا مذاق اُڑا کر رشید کو خوب جلایا۔

"ہونہہ بچّے کا پالنا بھی کوئی کمال ہے؟" اس نے غرور سے جواب دیا۔

"میں اسے پندرہ روز سے بڑے مزے سے پال رہا ہوں"

"پندرہ روز سے پال رہے ہیں؟ پندرہ روز؟ کیا کہنے ہیں آپکے" برجو ہنستی رہی "اور جیسا آپ پال رہے ہیں وہ خوب نظر آرہا ہے —— یہ —— یہ —— دیکھئے —— واہ"! اُس نے بچّے کے کُرتے کا مذاق اُڑایا اور بکھری ہوئی چیزوں کو سمیٹنے لگی۔

"آپ تکلیف نہ کریں میں اسے نہلا کر ابھی سب کچھ ٹھیک کر لوں گا" اور وہ اُسے بڑی احتیاط سے نہلانے لگا۔

برجو کی معترض نگاہوں کے آگے رشید کے اُڑے ہوا س چلدیئے۔ کئی دفعہ بچّہ پھسلا اور خود رشید کے کپڑے کیچڑ اور پانی میں ڈوب گئے۔ برجو ہنستے ہنستے لوٹ گئی جبکہ رشید اور کھسیانہ ہوگیا۔ جب بچّہ کی آنکھوں میں صابن لگا تو برجو سے نہ رہا گیا اور وہ بے چین ہو کر بڑھی اور بچّہ کو لے لیا۔

"ہٹئے آپ تو مار ہی ڈالیں گے بچارے کو"

"ہونہہ۔ یعنی اتنے دن سے ——"

"اُدھ موا تو کر دیا" برجو نے بچّے کو سلیقہ سے سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو گویا آپ بڑی ماہر ہیں۔ دیکھیں تو آپ کیا کمال دکھاتی ہیں" رشید نے اپنے کپڑے نچوڑتے ہوئے ایک طرف ہو کر کہا۔

برجو نے بچّہ کو نہلا کر بدن پونچھنا چاہا تو رشید بے طرح گھبرا گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھ کر اپنی قمیص کھونٹی پر سے اُتاری۔ کیونکہ کل چادریں اور تولئے کیچڑ میں بھرے کونے میں پڑے تھے۔

"قمیص سے؟" برجو نے بُرا مان کر کہا اور رشید سر کھجانے لگے۔

" لائیے وہ میز پوش!" برجو نے معاملہ کو سمجھ طعن سے مسکرا کر کہا۔ جب بچہ نہا چکا تو رشید تازہ دھلا ہوا بنیائن لئے بڑے مستعد کھڑے تھے۔ برجو نے صرف نفرت سے بنیائن دور پھینک دیا اور بچے کو اسی تولئے میں لپیٹ کر کھڑی ہوگئی۔

" میں آج ہی اسے دے آؤنگا" رشید نے شکست خوردہ لہجہ میں کہا۔ اور اُداس ہو کر بیٹھ گیا۔

" آپ اسے مجھے دیدیجئے"

" آپ کو —— آپ کیا کریں گی —— میں تو پولیس میں دیدوں گا۔ وہ اسے پہنچا دیں گے اس کے گھر"

" اچھا تو ابھی چلئے —— جب تک اُسکے ماں باپ ملیں پولیس سے کہہ کر اسے میں رکھوں گی"

" آپ کیوں یہ دردِ سر مول لیتی ہیں"

" یہ دردِ سر نہیں" برجو نے اونگھتے ہوئے بچے کو پیار سے تھپکتے ہوئے کہا۔

---

پولیس بچے کے ماں باپ کا پتہ بھی نہ لگا سکی مصیبت کے مارے بلوے کی نذر ہو چکے ہونگے۔ برجو کا سارا وقت بچے کی دیکھ بھال میں گذرنے لگا۔ رشید وقتاً فوقتاً بچے کو دیکھنے آتا اور دونوں میں کبھی کبھی جھگڑا ہو جاتا۔ بچہ برجو سے ایسا مانوس ہوا کہ رشید کی ساری خوشامدوں کا جواب صرف مُنہ موڑ کر دیتا۔

برجو اور رشید میں بچے کی طرزِ پرورش پر بھی حجت ہوتی۔ وہ کہتا کہ یہ فراک لیس کو پہنا کر عورتیں مردوں کی جنس پر چوٹ کرتی ہیں اور برجو اُسے وہ تکیہ کے غلاف اور بنیائن یاد دلا کر شرمندہ کرتی۔ جو وہ کبھی بچے کو پہنایا کرتا تھا۔

رشید بچے کو خوب چھیڑتا اور رُلاتا۔ جس پر برجو بگڑ جاتی۔ وہ اُسے ہمیشہ برے

ناموں سے پکارتا۔ اور برجو کی فرمائش تھی کہ سینما کے مشہور ترین ہیرو کے نام پر اس کا نام رکھے۔ وہ بچے کو پیاری پیاری لوریاں سناتی تو رشید بالکل اس کا الٹا کرکے برجو کو چھیڑتا اور وہ کبھی بگڑ جاتی۔

"آپ ہوتے کون ہیں۔ میرا جی چاہے جو کچھ کروں۔ میرا بچہ ہے ——!"

"خوب! اور کیا میرا بچہ نہیں ہے؟ آپ کو بگڑنے کا کیا حق"

"یہ میں کب کہتی ہوں کہ آپکا نہیں" بھولپن سے برجو بولی" دونوں کا ہے"

"دونوں کا!" رشید نے امید اور بیم کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہوکر پوچھا۔

برجو کا سر جھک گیا —— اور وہ بچے کو لیکر دوسرے کمرہ میں بھاگ گئی۔

---

قوم نے پھر جاگنا شروع کیا بہت جلد چند معزز ہستیوں کو پتہ لگ گیا کہ ایک "مسلمان" بچہ ہندو کے یہاں پرورش پا رہا ہے۔ ہندوؤں کو بھی فوراً اس بچہ کی حمایت میں اُٹھنا پڑا۔ کیونکہ اُنہیں یقین تھا کہ بچہ کسی اونچی ذات کا ہندو ہے۔ دونوں کا خوف اور "اسلام خطرہ" میں ہونے کا خیال ظاہر کیا گیا۔ قوم کے سب سے بڑے خدمتگار یعنی ایڈیٹر گلا پھاڑ پھاڑ کر اُٹھنے لگے۔ اور پھر جلسے ہوئے جن میں اس بچے کے مذہب کے خطرے میں ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی تباہی کے آثار نظر آنے لگے۔ وہی بچہ جسے ہندو مسلمان دونوں نے دھتکار دیا تھا۔ اگر اپنی اور ہم انجام ہستیوں کی طرح سڑک پر کتوں کے ساتھ جھوٹے ٹکڑوں اور چچوڑی ہڈیوں کے پیچھے لڑ کر کسی روز فاقوں سے سڑک پر ہی آخری سانس لے لیتا تو کچھ نہ تھا۔ پر یوں اس کے دھرم کی گت اور اُس کے ساتھ ساتھ ہندوستان بھر کے مذہب کا زوال یقینی تھا۔ بھلا کس نے دیکھا

جاتا۔ معاملہ اور بڑھا۔ دونوں فریقوں نے لاتعداد گواہ اُس بچّے کے مذہب کو ثابت کرنے کے لیے مہیّا کر دیے۔ مگر رسّی کھنچتی ہی رہی۔ دونوں طرف زور شور سے چندے جمع کیے جانے لگے۔ اور باقاعدہ فنڈ قائم ہو گئے۔ جو شاید کسی زلزلہ زدہ شہر کے لیے بھی نہ کیے جاتے اور جب کہ نہ جانے کتنے ہی معصوم مذہب سے دُور جن کا دھرم صرف غربت تھی۔ فاقہ کشی میں گھرے ہوئے تھے لاکھوں روپیہ وکیلوں اور گواہوں کی جیبوں میں اُنڈیلا جا رہا تھا۔ یہ تو ہوئی ایک ملک کی مذہب پرستی۔

جو کبھی فیصلہ ہندوؤں کے موافق ہوتا تو فوراً اسلامی جھنڈے ہوا میں لہرانے لگتے۔ اللہ اکبر کے خارا شگاف نعروں سے سوتی قوم کو جگا دیا جاتا۔ روپیہ کی بوچھاڑ ہوتی اور بچہ دوسری پارٹی کی طرف منتقل ہو جاتا۔ لیکن فوراً ہی تالک دھاری پنڈت اور قوم کے موٹے موٹے لیڈر آکاش کے کُل دیوتاؤں کو تڑپ تڑپ کر پکارتے اور بچہ پولو کی گیند کی طرح کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر لڑھکا دیا جاتا۔ انسانی زندگی کا یہ کھیل انتہائی دلچسپی پر پہونچ گیا۔

معاملہ اور بھی نازک ہو گیا۔ برجو نے صاف انکار کر دیا کہ ثبوت ملنے سے پہلے وہ کسی طرح بچے کو جُدا نہ کرے گی۔ اُس کے ماں اور باپ انتہا سے زیادہ پریشان تھے۔ اُنھوں نے بہت سمجھایا کہ چولھے میں ڈالے بچّے کو اس سے دست بردار ہو جائے مگر وہ ایک ضدّی بچّی کی طرح اَڑ گئی۔ بچّے کی محبت، عوام کی زیادتی کہ وہ اُس کے پیچھے فضول لڑ رہے تھے اور اُوپر سے اسکی ضدی طبیعت، ان تین چیزوں نے مل جُل کر اُسے دیوانہ بنا دیا۔ یہاں تک کہ وہ رشتہ داروں کے سمجھانے پر اور بگڑ گئی۔

اُسے پروا نہ تھی کہ فیصلہ ہندوؤں کے موافق ہو یا مسلمانوں کے، وہ تو صرف بچّے کو چاہتی تھی۔

اور آخر اُس کے صبر کی انتہا ہو گئی جب بچّے کو ایک پارٹی کے حق میں مکمل

فیصلہ ہو جانے کی وجہ سے اُس سے درخواست کی گئی کہ وہ بچّے کو فوراً دیدے۔

"کبھی نہیں یہ میرا بچہ ہے" اُس نے باؤلوں کی طرح چیخ کر کہا۔

"تمہارا بچّہ؟" وکیل نے دھوکا کھا کر جرح کی۔

"میں نہیں دوں گی" وہ کچھ مجبور ہو کر اور بھی دیوانی ہو گئی۔

"تمہیں ثبوت دینا ہوگا کہ یہ تمہارا بچّہ ہے"

برجو نے پریشان ہو کر سر جھکا لیا۔ واقعہ ایک نئی صورت میں تبدیل ہونے لگا۔

"کیا کوئی ماں یہ ثبوت دے سکتی ہے کہ اُس کا بچہ اُسی کا بچّہ ہے"

دوسرے وکیل نے کہا "ثبوت یہی ہے کہ وہ اسکی ماں ہے اور وہ اُس کا بچّہ"

کچہری میں غلغلہ مچ گیا۔ برادری کی لاج اور بدنامی کا خاکہ اڑنے لگا۔ لالہ جی نے چاہا کہ وہ اُسے زبردستی گھر لے جائیں۔ مگر برجو پر ضد بری طرح سوار تھی۔

"نہیں میں اسے نہیں دونگی" اُس نے بچہ کو چمٹا کر کہا۔

"آپ دیکھتے نہیں کہ بچے کے جدا کرنے کے خیال سے ہی لڑکی کی حالت غیر ہو جاتی ہے اور پھر بھی آپ ثبوت مانگتے ہیں۔ دیکھئے ذرا دیکھئے۔ کیا اب بھی آپ کو کوئی شک ہے؟" وکیل نے کہا اور ممتا کا ایک دلدوز سین دیکھکر سب کے سر معنی خیز طور پر ہلنے لگے۔ کئی آنکھوں میں تو آنسو آگئے۔

"مگر تمہیں ثبوت دینا ہوگا! اس کا باپ کون ہے؟" جج کی بھاری آواز گونجی۔

"باپ؟" برجو نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں تمہیں بچّے کے باپ کا نام بتانا ہوگا"

"میں نہیں جانتی" برجو نے ہارتے ہوئے کہا اور اسکی آنکھیں بھر آئیں اور سر جھک گیا۔

"ظلم ہے یہ صریحاً ظلم ہے آپ ایک شریف لڑکی سے اُس کے ناجائز بچے کے باپ کا نام پوچھتے ہیں" بکواسی وکیل بولا۔

" یہ جھوٹ ہے" لالہ جی تڑپ کر بولے۔

" ہر باپ کو بیٹی کے ایسے معاملے کو جھوٹ کہنے کا حق ہے" وکیل بڑبڑایا۔

معاملے کی عجیب و غریب ہیئت کو دیکھکر برجو بدحواس ہو گئی۔

" یہ میرا بچہ نہیں ہے" اُس نے ذرا تیز ہو کر کہا۔

" ہا ___ سچ سچ ___ غریب لڑکی ___ عزت کے آگے ماتا کچلی جا رہی ہے" ___ وکیل نے تاسف اور درد بھرے لہجہ میں کہا۔

برجو نے بچے کو علیحدہ کرنا چاہا۔ لیکن وہ اُس سے چمٹ گیا۔ برجو اور بھی پریشان ہوئی۔ وکیل کی ہمت بڑھی۔

" بیسویں صدی میں ایسی بھی مائیں ہوتی ہیں۔ کیا تم اس بچے کو یتیم خانے میں چھوڑ دوگی تاکہ وہ قوم کے ناکارہ فرد کی طرح بڑا ہو ___ کیا تمہارا دل اس ناانصافی کو قبول کرے گا"

وکیل بے بات برجو سے الجھ پڑا۔ اور یتیم خانوں کی دردناک حالت کا ذکر کر کے اُس نے اُسے دہلا دیا۔ اُس نے بچے کو پیار سے اپنے قریب کر لیا۔

" میں اِسے نہیں چھوڑ سکتی" اُس نے خود سے کہا۔

" کوئی ثبوت، کوئی اور ثبوت؟ یہ بچہ تمہارا ہے۔ بشرطیکہ تم اِس کے باپ کا نام بتا دُو" برجو کے خاندان والوں کی چیخ پکار کے درمیان جج نے فیصلہ کیا۔

برجو کا سر پھر جھک گیا۔ اور جب اس کی شکست خوردہ آنکھیں دوبارہ اُٹھیں تو رشید کے چہرے پر پڑیں۔ جو پہلے ہی سے پریشان اور گھبرایا ہوا تھا۔ خاموشی سے لوگوں میں اشارے ہوئے۔ ایک دوسرے کو دیکھا گیا اور معاملہ صاف نظر آیا۔

رشید بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔ برجو نے بچے کو چھوڑ دیا اور وہ رینگتا ہوا رشید کے پاس جا پہونچا۔ محبت کا یہ دردناک سین دیکھ کر لوگوں کو بے اختیار آنسو چھپانا پڑے،

اور پھر غیب سے فرشتوں نے دیکھا کہ دو ہاتھ ایک رجسٹر پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ہاتھ برجو کا تھا اور دوسرا رشید کا۔

اب بھی اِن دونوں میں بچے کی وجہ سے ویسی ہی دلچسپ لڑائیاں ہوتی ہیں۔

"میرا بچّہ!" ایک کہتا ہے۔

"میرا بچّہ!" دوسرا ضد کرتا ہے۔

"ہم دونوں کا بچّہ!" دونوں اتفاقِ رائے سے فیصلہ کرتے ہیں۔

# تل

"چودھری —— اے چودھری —— سنو ——"

گنیش چندر چودھری چپ تھا۔

"شش ——"

"کیا جھینگر کی طرح شی شی کرے جا رہے ہو بیٹھی میں تھک گئی جو ——" .....

"چپکی بیٹھی گی کہ ——"

"مجھ سے نہیں بیٹھا جاتا —— واہ —— ساری پیٹھ تختہ ہو گئی —— ہائے رام —— ہنک —— ہنک ——"

"چچ چچ ——"

"مجھے سردی لگ رہی ہے ——"

چودھری چپ۔

"یہاں —— یہاں نیچے کولھوں میں چیونٹیاں سی کاٹ رہی ہیں۔"

"دیکھ رانی دس منٹ بھی نہیں ہوئے اور تو تھک گئی۔"

"اور کیا —— کوئی میں مٹی کی بنی ہوں، واہ" —— رانی نے اپنے موٹے ہونٹ پھیلائے اور مصنوعی سنگ مرمر کی چوکی سے نیچے پھسل گئی۔

" چڑیل ——— کہتا ہوں سیدھی بیٹھ ——— حرامزادی ———" چودھری نے رنگوں کی تھالی اسٹول پر پٹخی اور رانی کے کندھے پکڑ کر دو چار جھٹکے دیئے۔

" تو ——— تو ——— تو پھر تو" ——— وہ زمین پر لمبی لمبی لیٹ گئی۔ چودھری جلکر کوئلا ہوگیا ——— اس کا جی چاہا رانی کے چکنے چکنے سیاہ گالوں پر کھڑی کھڑی تھپیاں مارے۔ مگر وہ جانتا تھا پھر تو وہ بالکل ہی قابو سے باہر ہوجائیگی اور بہانہ کرکے رونے چیخنے لگے گی اور پھر وہ تصویر جس کے لئے وہ اتنی جان ماری کر رہا تھا نامکمل رہ جائے گی۔

" دیکھ تھوڑی دیر اور بیٹھی رہ ——— اور پھر ———" چودھری نرمی سے بولا۔

" تھک گئی نا ———" وہ لوٹ کر چت ہوگئی۔

" تھک گئی! ——— اور جو سڑک پر دن بھر گوبر بینتی تھی تو نہیں تھکتی تھی ——— کُتیا کہیں کی" چودھری کو پھر غصہ چڑھا۔

" کون بینتا تھا گوبر ——— تم بینتے ہوگے ——— واہ کیسے ساس نندوں کے سے طعنہ دیتے ہو ———" وہ روٹھ کر بیٹھ گئی اور چودھری کو یقین ہوگیا کہ آج کا دن تو گیا ہاتھ سے۔

" اچھا دیکھ گھڑی رکھی ہے یہ ——— بس آدھ گھنٹہ ——— سمجھی ———"

" آدھ گھنٹہ نہیں ——— بس چھ منٹ ———" وہ چوکی پر چڑھتی ہوئی بولی۔ بات یہ تھی چھ سات سے زیادہ تو اُسے گنتی بھی نہ آتی تھی۔ اور چودھری خوب جانتا تھا کہ چھ منٹ کے بہانے وہ اُسے آدھ گھنٹے جمائے رکھے گا۔ رانی نے کمر کو کھینچ کر لمبا کیا اور بھاری پھولدار مٹکی جھٹکے سے کاندھے پر رکھی اور بیٹھ گئی۔ مگر کتنی دیر کے لئے۔

" ٹھیک ہے نا ———"

" ہاں" ——— چودھری جلدی سے جھک گیا۔

"دیکھو تو ——"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے ——"

"دیکھو تو ——"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے ——"

تھوڑی دیر خاموشی سے برش چلتے رہے۔ رنگ پر رنگ دوڑتے رہے۔ مگر کوئی ڈیڑھ منٹ بھی نہ گذرا تھا کہ رانی نے لمبی سی سانس لی۔

"ہا —— بس چودھری —— ہو گئے چھ منٹ!"

"ہوں ہنک —— وہ جلدی جلدی کبھی اُسے اور کبھی ادھ بنی دھبلو والی تصویر کو دیکھنے لگا۔

"سردی لگ رہی ہے۔ چدّر اوڑھ لوں ——"

"نہیں ——"

"آ —— آ —— ئے —— جاڑا ——" وہ کتّوں کی طرح رونے لگی۔ چودھری چُپ ——

"کمر —— کمر —— میری کمر رے —— چودھری جی ——" اصل میں وہ آج شرارت پر تلی ہوئی تھی۔

"چدّر —— چدّر —— میری چدّر ——"

چودھری چُپ ——

"ہوں —— کہہ رہی ہوں میں تھک گئی۔ اب یہ ہنڈیا پٹخی ہوں ہاں نہیں تو ——" چودھری جلدی سے مڑا وہ یہ تصویر مکمل کرنے کے لئے ہنڈیا عجائب خانے سے مانگ کر لایا تھا۔ اگر رانی توڑ دے تو بس سمجھ لو کہ رانی کی کھوپڑی کی خیر نہیں۔

"تو پھر تھک جو گئی —— جوں کاٹ رہی ہے چودھری" —— وہ اپنے

گھنے ہوئے بالوں کو اُلجھانے لگی۔ اور پھولدار مٹکی نیچے لٹکا دی۔

چودھری نے پیر دُور دُور رکھ لئے۔ آنکھیں گھما کر لٹو کی طرح باہر نکال لیں اور غصّے سے اُس کے چہرے کا گوشت پھڑکنے لگا۔ اُس کی چتکبری چھدری ڈاڑھی کشتی کے بادبان کی طرح لہرانے لگی۔ جیسے بڑا بھاری طوفان آنے پر سفید سفید بادبان ہلتے ہیں اور اس کی گنجی چکنی کھوپڑی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئیں۔

"لیکے کمر تو دُکھ گئی ——" رانی نے ڈر کر جلدی سے اپنی نشست ٹھیک کر لی۔ اور پھر وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ارہو —— ہو —— ہو برررر ——" وہ ہونٹ بجا کر ڈکرائی۔

"و —— رو —— رو —— کوئی مر بھی جائے تو بھی —— رو رو —— برررر"

چودھری نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے گھورا —— جب کبھی بھی وہ رونے لگتی تھی تو چودھری کے رخساروں کی مچھلیاں پھڑکنے لگتیں اور ناک کا بانسہ ٹیڑھا ہونے لگتا اور بُرش ہاتھوں میں پھلجھڑی کی طرح ناچنے لگتے۔ طشتری کے سارے رنگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر ایک خلا میں تبدیل ہو جاتے اور اُسے کچھ نہ سُوجھتا اور یہ کرب کی حالت اُس پر جبتک طاری رہتی جب تک اُس کے دماغ میں چبھتا ہوا کانٹا نہ نکل جاتا اور رانی کی حرکتیں اس وقت کانٹے نہیں بھالے بن کر اس کی ہستی کے آر پار نکلی جا رہی تھیں۔

ہر ذی روح پر چودھری کے اِس دورے کا پورا پورا اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ رانی نہ بچ سکی۔ اُس نے پھر اپنے پیٹ کو اندر پچکایا اور ہونٹوں سے پھر کنی سی آواز نکالتی ہوئی سیدھی ہو بیٹھی۔

تھوڑی دیر تک دُنیا پھر اپنے محور پر گھومتی رہی۔ چودھری کا برش سپاٹے

بھرتا رہا - رنگ کی کھال گندی اور بدشکل ہوتی گئی - لیکن ــــــ

"چودھری" اس دفعہ راتی پیار سے بولی - چودھری کی بغل میں جیسے چوہا سا کودا -
دُنیا کے محور کا ایک پایہ ذرا اچکا ــــــ جانے بھائی محوریں پائے لگے ہوتے ہیں یا نہیں
ــــــ لیکن ہوا کچھ نہ کچھ ضرور!

"چودھری تم نے یہ دیکھا ہے ــــــ"

چودھری کے کندھے جھرجھرائے - اور چکنی ڈلی کی شکل کی کھوپڑی میں پسینے کے
دانے پھوٹ نکلے - وہ پھر بولی -

"یہ دیکھو ــــــ یہ کالا تل! ــــــ یہ دیکھو گردن سے ذرا نیچے ــــــ
اور نیچے ــــــ ذرا اُلٹی طرف ــــــ" ایک ہاتھ سے بھولدار مٹکی پکڑ کر اور ہونٹ
لٹکا کر اپنی گردن سے نیچے جھانکنے لگی -

"دیکھا ہے یہ ــــــ تل ــــــ اور ــــــ تم تو دیکھ رہے ہو چودھری"
وہ بن کر شرمانے لگی " واہ مجھے شرم آتی ہے "

"سیدھی بیٹھ ــــــ" چودھری غرّایا -

"اوں ــــــ بڑے آئے ــــــ بھلا کوئی کسی کا تل بھی دیکھتا ہوگا - اور
جب وہ ایسی بُری جگہ ہو ــــــ ہی ــــــ ہی ــــــ ہی ــــــ" وہ اترائی
ــــــ" بری جگہ ہے ــــــ تل ــــــ تم نے دیکھ تو لیا - بولو ــــــ"

"میں نے تل ول کچھ نہیں دیکھا اور نہ دیکھوں ــــــ" بدمزاجی بڑھی -

"ہوں ــــــ جھوٹے ــــــ سراسر - کانڑی آنکھ کر کر کے دیکھ رہے
ہیں اور ــــــ ہی ــــــ ہی ــــــ" وہ آوارہ عورتوں کی طرح اٹھلائی -

"راتی"

راتی نے صرف ناک اُچکا دی -

چودھری مغلوب ہو کر کاٹھ کے خالی ڈبے پر بیٹھ گیا ——

" تجھے معلوم ہے کہ میں کتنا بڑا ہوں ——"

" ہائے رام —— کوئی ..... کتنے بڑے ؟" وہ بھی ٹکٹکی لگا کر آگے جھک گئی۔

" میں تیرے باپ بلکہ دادا برابر ہوں —— اور تو —— تو بتا تو کتنی ہوگی ؟

—— پندرہ برس سے آگے نہیں اور تجھے یہ بدمعاشی کی باتیں کس نے سکھائیں"۔

چودھری دادا برابر تو کیا اس کے باپ برابر بھی نہ ہو سکتا تھا۔ ذرا معاملہ کو دبانے کے لئے کہہ دیا تھا اس نے۔

" اوں —— بدمعاشی کی باتیں تم کرتے ہو کہ تل دیکھتے ہو —— ایسی بری جگہ تو تل ہے ——" وہ آہستہ آہستہ تل ٹٹولنے لگی۔

" ذرا سی چھوکری ——"

" ذرا سی چھوکری —— ذرا سی کاہے کو ہوں واہ —— ذرا سی کہتے رہتے ہو —— ذرا سی ہوتی تو ——"

" تو ؟ —— تو —— تو کیا ؟"

" رتنا کہتا ہے جس کی چھاتی پر یہ تل ہوتا ہے وہ —— وہ ——"

" رتنا ؟ —— یہ رتنا کو کیا معلوم تیرے کہاں کہاں تل ہیں ——"

" میں نے دکھایا تھا ——" وہ تل کو آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔

" تو نے —— تو —— تو —— تو نے رتنا کو دکھایا تھا تل ——"

چودھری کا پھر خون کھلبلایا اور بغلوں میں جو سے پھدکے اور گالوں کا گوشت ہلا —— پھر برش پھلجھڑی کی طرح تھرکنے لگے۔ اور رنگ ملنے شروع ہوئے۔

" آ —— تو —— واہ —— اس نے دیکھ لیا تو میں کیا کرتی ——"

" کیسے ، کیسے دیکھ لیا —— تل اس نے جبکہ تو ——" چودھری کی ہچکی

ڈھیلے کواڑوں کی طرح بجنے لگی۔

"نہا رہی تھی میں تو اُس نے —" اُس نے مٹکی سنبھالی اور نشست پر سجنے لگی۔

"تو نہا رہی تھی — اور — وہ آگیا — حرامی پلا —"

"ہاں تلیا پر نہا رہی تھی — مجھے اکیلے ڈر لگا کہ کوئی آ نہ جائے۔ اِس لئے میں اُسے سنگ لے گئی — کوئی آجاتا تو — میں نہا رہی تھی — شلوکہ بھی دھویا —"

"مجھے ڈر لگا کہ کوئی آ نہ جائے۔ اِس لئے تو اُسے لے گئی —"

"ہاں —" اُس نے بھولپن سے فیصلہ کیا۔

"رانی —" وہ آگے بڑھا —

"آں — میں نے اُس سے کہہ دیا تھا اُدھر منہ رکھیو — مگر —"

"مگر — ؟"

"مگر وہ دور بیٹھا رہا — پھر میں نے کہا رتنا میرے تل ہے بڑی بُری جگہ — وہ بولا نہیں تو، میں نے کہا تو نہیں دیکھتا تو مت دیکھے — ہاں بھئی مجھے کیا ؟ — کیوں چودھری —"

"پھر تو کیسے کہتی ہے اس نے تل دیکھا ؟"

"ہاں پھر میں ڈوبنے جو لگی۔ پانی اِتّا اِتّا گہرا تھا" وہ تل سے ذرا نیچے انگلیاں رکھ کر بولی۔

"قطامہ !" چودھری برش پھینک کر لکڑی کی طرف چلا —

"ہائے رے رام — پھر — پھر سنو تو — چودھری — تو کیا میں ڈوب جاتی ؟"

"تجھے تیرنا نہیں آتا — کُتیا ؟ رات دن ہو دی میں جو ڈبکیاں لگاتی

تھی تب نہ ڈوب مری ——"

"واہ —— واہ میں کیوں ڈوبتی —— میں —— میں —— تو تل دکھا رہی تھی ——"

"تو نے تل دکھانے کے لئے بہانہ کیا تھا ——"؟ چودھری نے پتلی سی قینچی ہوا میں نچائی۔ وہ اب مسکرا رہا تھا۔

"ہائے رام —— مجھے —— دھوتی تو اوڑھ لینے دو —— چودھری جی" وہ بندریا کی طرح اُچک کر کھاٹ کے اوپر جا کھڑی ہوئی۔

"جو تم مارو گے تو سڑک پر بھاگ جاؤں گی چودھری، پھر مجھے شرم آئے گی —— میں کہہ دوں گی چودھری —— چودھری ——"

بڑھا رُک گیا "کیا کہہ دے گی ——"

"میں کہہ دوں گی چودھری کہتا ہے کہ —— میرا تل —— اُم —— اُم ——"

"بچی!" چودھری پاگل کیسے سڑک کی طرح ناچ اُٹھا۔ رانی سمجھ گئی کہ تیر نشانے پر بیٹھا!

"سب سے کہہ دوں گی —— سُنا چودھری! مارو تم مجھے —— مار کے بھی دیکھ لو —— واہ ایسے کیوں گھور رہے ہو —— اتنی تو چھوٹی ہوں میں ذرا سی چھوکری —— بڑے خراب ہو تم جی ——" وہ ہلکے ہلکے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

چودھری سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک دفعہ کو جی میں آیا۔ اُٹھ کر تصویروں میں تو لگا دے آگ اور رانی کو اتنا کوٹے اتنا کوٹے کہ کچومر بنا دے مگر پھر اسے نمائش یاد آ گئی جس میں اسے پانچ ہزار کا انعام ملنے والا تھا۔

ایک تو اس کا سر ویسے ہی گھوم رہا تھا۔ وہ تصویریں تو بنانے لگا تھا اور ہزاروں ہی تصویریں بنا کر چھوڑ دیں۔ اُس نے کھِلتے ہوئے گلاب کا شرمایا ہوا رنگ

ٹھٹھے مارتا ہوا سبزہ، ناچتا تھرکتا آبشار بھی بنا یا تھا۔ اُس نے سرد آہوں اور بھینی خوشبو تک کو رنگ میں سمو کر رکھا دیا تھا۔ دُور دُور کے ملکوں کی ننگی اور آراستہ پیراستہ عورتیں بھی اُس کے سامنے گھٹنوں بیٹھنے کا فخر حاصل کر چکی تھیں۔ مگر یہ چلبلی گنوار چھوکری جسے اُس نے موری کی غلاظت سے اُٹھا کر اپنے آئندہ شاہکار کے لئے چُنا تھا۔ اُس کے قابو میں نہ آئی۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ ہزاروں رنگ بکھیرنے پر بھی وہ اُس کے جسم جیسا مسالہ نہ تیار کر سکا۔ اُس نے سیاہی میں صندل گھول کر اُس میں ذرا سا نیلا رنگ ملا دیا۔ پھر بھی اس کے رنگ کی چمک آبنوسی۔ صندلی۔ نیلی اور کچھ بادامی لہر لئے ہوئے تھی۔ ایک مصیبت ہوتی تو خیر تھی۔ آج اس کا رنگ سُرمئی ہوتا تو دوسرے دن اس میں شفق کی سی سُرخی پھوٹنے لگتی ——— اور پھر کبھی بالکل اچانک اُس کا جسم ختم ہوتی ہوئی رات کی طرح کچھ اودی اودی گھٹاؤ سے ملنے لگتا۔ اور کبھی نہ جانے کہاں سے اُس میں سانپ کے زہر کی سی نیلاہٹ جھلکنے لگتی۔

اور آنکھیں بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتیں، اُس نے پہلے دن نہایت اطمینان سے کولتار کا سا سیاہ رنگ گھول کر تیار کر لیا ——— لیکن پھر اُسے پتلی کے گرد لال لال ڈورے نظر آئے ——— خیر وہ بھی ہوا، پھر اُن ڈوروں کے آس پاس کی زمین بادلوں کی طرح نیلی معلوم ہونے لگی۔ وہ جھنجھلا گیا اور ڈھیر سا رنگ بیکار کیا۔ لیکن اُس کے غصے کی جب تو انتہا ہی نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ ذرا سی دیر میں وہ کولتار جیسی پُتلیاں سبز ہونے لگیں۔ اور ہوتے ہوتے دو زمرّد کی ڈلیوں کی طرح ناچنے لگیں۔ پُتلیوں کے آس پاس کا میدان دودھیا سفید ہو گیا۔ اور ڈورے قرمزی ہو گئے ——— اُف! وہ سر پکڑ کر جھومنے لگا ——— اور اوپر سے یہ باتیں۔

"مچھّر کاٹ گیا ———" وہ بچّوں کی طرح منمنائی۔

آج چودھری نے ارادہ کرلیا تھا کہ وہ گھُنّا سا دھ جائیگا اور بولے گا ہی نہیں۔

"اتنے مجھے کاٹتے ہیں کہ کیا بتاؤں ـــــ یہ مچھر ـــــ"

چودھری چُپ!

"ہائے رے کیسے کاٹتے ہیں ـــــ یہ مچھر ـــــ" اُس نے موٹی سی ایسی بازاری گالی بکی جو کچھ عام بھی نہیں۔

چودھری اُچھل پڑا! گالی۔ یعنی یہ لڑکی ہو کر اتنی موٹی گالی جانتی ہے! وہ خود سوائے چند بالکل زباں زد گالیوں کے ایک بھی گہری قسم کی گالی نہ جانتا تھا۔ اُس نے کبھی گالیوں کے مسئلے پر غور ہی نہیں کیا اور یہ گالی تو شاید داروغہ جی کو بھی نہ آتی ہوگی۔ وہ بھی صرف چند مخصوص الفاظ استعارے کے طور پر استعمال کر لیتے ہیں۔ محض ضرورتاً!

"یہ تونے گالیاں کہاں سیکھیں؟" وہ مڑ گیا۔

"کونسی ـــــ یہ ـــــ" اُسنے پھر بھولپن سے گالی دہرائی۔

"ارّا ہی!" وہ بھبکا!

"چُنّن نے دی تھی ایک دفعہ مچھّروں کو ـــــ اس کی کھولی میں بھی بہت مچھّر ہیں ـــــ" وہ بات ٹالنے لگی۔

"اُس کی کھولی؟ ـــــ تو اُس کی کھولی میں بھی گئی تھی ـــــ"

"ہاں۔ وہ لے گیا تھا کہ چل، گڑدھانی کھائے گی۔"

"پھر گڑدھانی کھائی تونے؟"

"کہاں؟ گڑدھانی تھی بھی نہیں، جھوٹ بول رہا تھا۔ مگر اب لا دیتا ہے"

"تجھے چُنّن گڑدھانی لا دیتا ہے ـــــ"

"ہاں اور کھیلیں" وہ مٹکی پر نقش و نگار ٹٹولنے لگی۔

"اور کھیلیں —— !!" چودھری جانتا تھا کہ وہ بے کار حیرت زدہ ہو رہا ہے۔ رانی گڑدھانی پر فریفتہ تھی۔ وہ چُنّن کی کھولی چھوڑ موری میں کُتّے کے جبڑوں میں سے گڑدھانی نکال کر کھا سکتی تھی۔

"میں نے تجھے پیسے دئیے پھر بھی تو چُنّن کی گڑدھانی لیتی ہے"

"اوں۔ میں کب لیتی ہوں۔ میں کوئی منگتی ہوں۔ وہی دیتا ہے۔ کہتا ہے چل کھولی میں —— مجھے تو وہ آپ بُرا لگتا ہے۔ ایسی بڑی بڑی مونچھیں ہیں —— مجھے تو چھینکیں آنے لگتی ہیں۔ خوں —— خوں ——" وہ ناک سکیڑ کر پھڑپھڑانے لگی جیسے کسی نے اُس کی ناک میں بتی کر دی ہو۔

"ذرا بیٹھ کھجا اوں —— چودھری ——" پھر چودھری پر وہ دَورانی کیفیتیں چھانے لگیں۔ بھیجے میں تالیاں سی بجنے لگیں اور گال اوپر نیچے کودنے لگے۔ پانچ ہزار روپے کھنن کھنن اِس سے دور ننھے ننھے تاروں کی طرح ناچ ناچ کر بھاگنے لگے۔ بُھورا، کالا، سُرمئی، اور پیلا سب رنگ ایک دوسرے سے دست و گریبان ہونے لگے اور کھوپڑی پر آبلے سے اُبھر آئے۔

---

اب سوال یہ تھا تصویر بنائے یا پاگل ہو جائے۔ اگر یہی چال رہی تو وہ دن دور نہ تھا جب وہ سچ مچ کپڑے پھاڑ کر سڑک پر باؤلے کُتّے کی طرح لوٹ لوٹ کر اپنا سوکھا مارا جسم چھیل ڈالے اور اپنے دہکتے ہوئے سر کو تلییّا کے پانی میں ڈبو دے۔

یونہی اُس کے قدم تلییا کی طرف اُٹھ گئے۔ تلییّا دور نہ تھی۔ عموماً وہ وہاں گھنٹوں ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں کو سطحِ آب پر تھرکتے ناچتے دیکھنے چلا جایا کرتا تھا۔ اور وہ شاعر تھا —— پیدائشی شاعر، وہ دُنیا میں تو رہتا تھا۔ مگر دنیا سے کتنا دور، بڈھا تو وہ نہ تھا —— مگر جوان بھی اُسے کوئی نہ کہہ سکتا

تھا۔ اُس نے ڈاڑھی لاپروائی کی وجہ سے چھوڑ رکھی تھی۔ اور وہ کچھ یوں ہی سی چتکبری ہو چلی تھی۔

"اوہ!" پھر اس کی بغلوں میں کوئی چیز پھڑپھڑائی —— رانی کے ہنسنے کی آواز ایک بھرائی ہوئی مینڈک کی آواز کے ساتھ آئی۔ مینڈک ہی ہوگا۔ اور کیا۔ برسات —— خیر برسات تو دور تھی —— مگر نہیں مینڈک نہیں بلی غُرّائی ہوگی —— بلی تو کیا ہاں کچھ ہوگا ضرور ——

لیکن جب اُس کی پارسا آنکھوں نے رانی کو رتنا کے سنگ پانی میں چہلیں کرتے دیکھا تو تھوڑی دیر کے لئے وہ اُسے بھی اپنے تخیل کا فریب سمجھا۔ تخیل اُسے چھیڑنے کے لئے نئے نئے بہانے تراشا کرتا تھا۔ اور آج تو حد کردی۔

لیکن جب وہ آگے بڑھا تو ہنسی کے زمزمے رُک گئے اور دو حیرت زدہ سنگ موسیٰ کے سے مجسمے آنکھیں پھاڑنے لگے۔ کس قدر صاف تھا اوہمہ بالکل بال بال صاف، رتنا کے پٹھوں کا اُبھار۔ پانی سے بھیگی ہوئی اس کی لمبی چوٹی —— قریب قریب بیٹھی ہوئی دو آنکھیں —— اور رانی کی الجھی ہوئی چوٹی —— وہ سُرمئی، عنابی، صندلی، کافوری اور نیلے رنگ کی آمیزش سے بنا ہوا جسم اور تِل! —— وہ تِل! اُبھرا ہوا —— گولی کی طرح چودھری کے سینے میں آکر کھٹ سے لگا —— ایک طرف کو سرکتا، بچتا رتنا تو نکل گیا۔ اور بھاگا دھوتی اٹھا کر۔ اور رانی دلیری سے کھڑی چھپ چھپ کرتی رہی۔ چودھری کو معلوم ہوا کوئی اُسے جھولے میں ڈال کر لمبی لمبی پینگیں دے رہا ہے۔

"تِل دیکھ رہے ہو میرا —— بڑے برے ہو جی ——" وہ منانے کے لئے اٹھلانے لگی۔ چودھری شکر ہے کہ کھڈ کے کنارے آکر سنبھلا۔

"باہر نکل —— !" اُس نے اِس نئے چودھری کو پرے دھکیل کر کہا جو دھیمے

دھیمے ڈوبتا جا رہا تھا۔

"اوں - تم مارو گے ——" وہ پانی میں سے اوپر اُبھر آئی۔

"آج تجھے اُدھیڑ کر نہ ڈال دیا ہو تو میرا نام چودھری نہیں ——" چودھری نے خود کو یقین دلایا کہ یہ وہی تو چھوکری تھی جو کیچڑ میں مینڈکی کی طرح پل رہی تھی۔

"عورت پر ہاتھ اُٹھاتے شرم نہیں آئے گی؟ ——" چودھری سُلگ گیا۔

"ننگی عورتوں کو پیٹتے ہو؟ —— واہ ——" وہ اور اوپر اُبھری ——

"شرم نہیں آتی ——" وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔ اور پانی اُس کے ٹخنوں تک آ رہا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی۔ اسی لئے ذرا اکڑ کر باتیں کر رہی تھی۔

"اوں —— جاؤ ——" وہ شرمانے لگی۔

"چودھری کے ہاتھ سے وہ بچکتی ہوئی مچھلی گر گئی۔ اور اس کا قد کئی انچ لمبا ہو گیا۔ اُس کے بازو پھول گئے۔ اور بھیجے میں سُرسُریاں سی رینگنے لگیں۔ بھوبل کے انبار کو ٹھنڈی ٹھنڈی بھیگی ہوئی سیاہ آندھی بہا لے گئی اور چنگاری بھڑکی —— دھڑ دھڑ دھڑ —— شعلے لپکنے لگے —— اُس کی آنکھیں بھوکی چیلوں کی طرح سیاہ اُبھرے ہوئے تل پر جھپٹیں اور —— اوہ کمن سے جیسے وہ تل ایک سیاہ چٹان بن کر اسکے ماتھے سے ٹکرایا۔ ایک دم وہ لوٹ پڑا اور پٹے ہوئے کتے کی طرح بھاگا۔ کدھر اپنے کمرے میں پلنگ کی طرف۔ اُسی دن اُسنے رتنا کو نکال دیا —— وہ بہتیرا کہتا رہا کہ وہ لنگوٹ پہنے تھا۔ مگر چودھری پر تو بھتنا سوار تھا۔ وہ ساری رات خیالات کی فوج کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ کوئی چیز اُس کے جسم میں برمے کی طرح سوراخ کر رہی تھی —— مگر سوراخ ہو ہی نہ چکتا تھا —— جیسے کوئی چٹان رستے میں آ گئی ہو ——

آج اُسے اپنی تصویروں میں لگانے کو رنگ مل رہے تھے!۔ کتھئی میں ذرا سی نیلا ہٹ ملا دینے سے بالکل وہی —— وہی بھیگا ہوا سمندر کی تہ جیسا گہرا اور

جیتا جیتا رنگ بن گیا ——— اور آنکھوں کے لئے بھی بس سیاہی میں ہلکی سی سبزی ——— نہیں اُودا ہٹ یا شاید سُرمئی رنگ اور پھر گلابی گوٹ ——— جہاں آنکھیں ختم ہوتی ہیں نا۔ اُس نے چاہا آئینے میں اپنی صورت دیکھے ——— لیکن آئینہ تو جانے اُس نے کب سے نہیں دیکھا تھا ——— ایک مصور کو آئینہ دیکھنے کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں آئینے میں دیکھنے کے لئے ہوتا ہی کیا ہے؟ اُس کا آئینہ تو وہ ساری تصویریں تھیں جن میں چہرہ تو چہرہ اس کی روح کا کونا کونا نظر آتا تھا۔ اُس کا دل اور دماغ سب ہی کچھ تو رنگوں میں سمویا ہوا سامنے موجود تھا۔

پھر بھی اُس نے چاہا کہیں اپنی صورت دیکھے! اُس نے ایک ٹین کے ڈبے کو جس میں اُس کے رنگ دُور دُور کے شہروں سے آیا کرتے تھے۔ اُلٹ کر جھاڑا ——— دو جھینگر پھُدک کر اس کی ناک پر ٹپا کھاتے اُڑ گئے ——— مکڑی کا جالا اُس نے کہنی سے جھاڑ کر اُس میں اپنا منہ دیکھا ———

پہلے تو اُسے کچھ نظر نہ آیا ——— جیسے سمندر کی تہ میں باریک باریک جھاڑ اور پھندنے سے ہوتے ہیں ——— یا جیسے آنکھوں میں پلکیں گھُس جاتی ہیں تو پھیلا پھیلا دکھائی دیتا ہے ویسا دکھائی دیا ——— پھر ایک بھیانک ڈاڑھی اور پیاسی پیاسی آنکھیں دکھائی دیں ——— اوہ یہ وہ خود تھا! وہ؟ وہ ——— جو ——— مگر ایسا تو کبھی تھا ہی نہیں ——— ایسا؟ اُس نے ٹین کا ڈبہ اوندھا دیا اور بغیر آئینے کے اپنی صورت دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے ڈاڑھی تو خیر نظر آئی اور ایک آنکھ بند کرنے سے تھوڑی سی کالے دھبے والی ناک اور پھولی ہوئی مونچھ دکھائی دی ——— مونچھ! ——— اگر قینچی ہوتی تو وہ ——— ذرا ——— ذرا سا مونچھ کو ویسا کر دیتا ——— رانی کہتی تھی چنّن کی مونچھوں سے چھینکیں آنے لگتی ہیں ——— فوں ——— فوں ——— وہ خود بھی ناک بجانے لگا۔ یہ تو خیر معلوم تھا کہ وہ تنہا لنگوٹ پہنے تھا ———

کیا عجب دھوتی بھی ہو —— پہنے ہو —— یا پہننے والا ہی ہو کہ وہ آگیا ——
مگر یہ چیتھن اور اس کی گرڈ دھائی!

اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے کمرے کی دیواریں گرڈ دھائی کی بنی ہوئی ہیں اور وہ اُسے بھینچے ڈال رہی ہیں —— وہ ایک پسی ہوئی مکھی کی طرح گرڈ دھائی کے ایک بڑے سے ڈھیر پر چپکا ہوا ہل رہا ہے۔ جب وہ ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا اور ٹانگیں شل ہو گئیں تو وہ اسٹول پر ٹک گیا —— پردہ ہٹا کر اُس نے اپنی ادھوری محنت کو دیکھنا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے داغ دھبے گھومنے لگے اور ایک دم ٹھہر گئے —— شانے پالش کئے ہوئے چمڑے کی طرح چمکنے لگے اور آنکھوں میں نیلی، ہری، کالی روشنیاں گھومنے لگیں۔ —— اور تل! یہ تل کہاں سے آیا۔ سانپ کی طرح گول کنڈلی مارے اُبھرا ہوا تل! ٹک ٹک۔ ٹک ٹک۔ گھڑی کی طرح اُس کا دل ہلنے لگا۔

وہ ایک دم اُٹھا اور اس کے پیر رانی کی کوٹھری کی طرف اُٹھ گئے۔ گندی میلی چھوٹے سے دروازے کی گھٹی ہوئی کوٹھری! وہ کل ہی اِسے اونچا کرائے گا —— نہیں —— اونچا نہیں —— وہ جو دوسرا کمرہ ہے۔ جسمیں خالی ڈبے پڑے ہیں وہ ٹھیک ہے۔ وہ اندھیرے میں بڑھنے لگا —— اُس کا دل اب بھی گھڑی کی طرح ٹک ٹک کر رہا تھا۔ کوٹھری کی سیاہی گھلی ہوئی کالونچ کی طرح اُس کے چاروں طرف لپٹ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ چارپائی سے ٹکرائے اور —— پھر بان کے جھولے میں دھنس گئے —— اُس نے جلدی جلدی سارا پلنگ ٹٹول ڈالا۔ مگر رانی نہ تھی!۔

سارے بدن پر جیسے مچھروں نے لپٹ کر چٹکنا شروع کیا —— موٹے موٹے، قہقہے لگاتے ہوئے مچھر! —— اور پھر گرڈ دھائی کی سلیں کی سلیں اُس پر ٹوٹ پڑیں۔

صبح اُس نے چاہا رآنی کی چُٹیا اینٹھ کر اُس سے پوچھے حرامزادی یہ رات کو کہاں گئی ——— مگر کوئی کہے گا کہ وہ راتوں کو اس کا پلنگ کیوں ٹٹولتا ہے۔

وہ چُپکا کام کرتا رہا۔ اور رآنی بھی آج نہ بولی۔ وہ چاہتا تھا کچھ تو بولے۔ شاید رات کے اُڑنے کا پتہ چلے مگر وہ مُنہ بنائے روٹھی بیٹھی رہی۔

"کیوں کیا تھک گئی؟ ———" اُس نے اُسے مٹکی رکھتے دیکھ کر نرمی سی پوچھا۔ آج وہ اُس سے لڑنا نہ چاہتا تھا۔

"اور کیا ——— میں مٹی کی بنی ہوں؟ ———" وہ اپنی کمر دونوں ہاتھوں سے دبانے لگی۔

چودھری کا جی چاہا کوئی نرم سی بات کہے۔ مگر اُسے اپنا انداز بدلتے ذرا شرم آئی۔

"لے بس اب سستا چکی ———" وہ سمجھتا تھا کہ شاید وہ لڑے گی اور ——— خیر۔ مگر رآنی نے مٹکی اٹھا کر پھر جسم کو ویسے ہی اکڑا لیا۔

آج رنگ تنتنا اُٹھے۔ جو رنگ لگایا منہ چڑانے لگا ——— آج اُس نے سوچا تھا تِل بھی بنا دے گا۔ یونہی ——— تصویروں میں کیا تِل نہیں ہوتے۔ مگر رنگوں کے مزاج بگڑے دیکھ کر وہ ٹال گیا ———

جب رآنی اُٹھ کر چلی تو گُڑ دھانی کا ٹکڑا اُس کی دھوتی میں سے گر پڑا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ مگر چودھری کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُسکے سر پر سائبان ٹوٹ پڑا۔

"یہ ——— گُڑ دھانی ———!" اُس نے غصے سے جھاگ اُڑانے شروع کئے۔ پہلے تو وہ رُکی کہ اُٹھا لے۔ مگر چودھری کے تیور دیکھ کر وہ چل دی۔

"تم کھا لو ———" اُس نے غرور سے گردن اُٹھا کر کہا۔

چودھری پر پھر مرگھٹ کا بھُتنا سوار ہو گیا ——— وہ رآنی کو جاتے ہوئے دیکھتا

رہا ــــ اور پھر ایک دم جوتے کی ایڑی سے اُس نے گڑھائی کو زمین پر رگڑکر پیس ڈالا ــــ

دوسرے دن راکی خدا جانے کہاں غائب ہو گئی۔ اُس نے دو چار کپڑے لینے کی بھی تکلیف گوارا نہ کی جیسی آئی تھی ویسی ہی پھر سُوت کیچڑ میں رُلنے کے لئے چل پڑی۔

چودھری کی تصویر نامکمل ہی رہ گئی! پانچ ہزار روپے ایک سیاہ دھبے کی صورت میں اُس کے دماغ پر جم گئے ــــ سیاہ دھبہ جیسے ننھا سا اُبھرا ہوا تل ــــ مگر کتنی بُری جگہ تھا یہ سیاہ جلا ہوا نشان ــــ بالکل چودھری کے کلیجے میں!

اس کے بعد وہ اور بھی پریشان رہنے لگا ــــ ڈر کے مارے وہ کسی سے کہتا بھی نہ تھا کہ راکی بھاگ گئی۔ اُسے ڈر لگتا تھا کہ کہیں کوئی کہہ نہ دے کہ آخر بھاگ گئی تو کیا ہوا، وہ کیوں مرا جاتا ہے۔ لہذا دن گذرتے گئے، وہ تصویریں بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر اب کوئی چھ چھ آنے میں بھی اُس کی تصویریں نہ لیتا تھا۔ کیونکہ وہ اسقدر بھدّے، ڈراؤنے اسیاہ، بھورے اور کالے رنگ شفق اور پھولوں میں بھرنے لگا تھا کہ لوگ اُسے اُلّو سمجھتے تھے۔ اُس کے سارے رنگ گڈمڈ ہو کر خلا میں تبدیل ہو چکے تھے۔

اس کے بعد اور بھی غیر دلچسپ واقعات پیش آنے لگے۔ لوگ راکی کے متعلق اُس سے بار بار پوچھتے، وہ کہہ دیتا نہ جانے کہاں گئی۔ مگر لوگ ایسے سیدھے سادے جواب کو کب پسند کرتے ہیں؟

"چودھری راکی کو بیچ آیا"

"ایک سوداگر آیا تھا جو کئی ہزار دے کر لے گیا"

"رانی سے بُرا تعلق تھا ــــ ناجائز ــــ کہیں پار کر دیا ــــ"

جتنے منہ اُس سے دونی باتیں۔ چودھری کی زندگی اندھیری کوٹھری بن گئی معلوم ہوتا تھا دنیا اُسے تل کے کھا جانا چاہتی ہے۔ یہی نہیں، لطف زندگی تو جب آیا جب رانی ایک چھوٹی سی خون آلود گٹھڑی ایک الگ سے راستے میں رکھتی ہوئی پولیس کے ہتھے چڑھ گئی۔ فوراً گاؤں پر چڑھائی ہوئی اور چودھری کے رہے سہے ہوش گم ہو گئے۔ رانی کے گم ہونے کا عقدہ بالکل آسانی سے کھل گیا۔ اور چودھری ہکا بکا منہ پھاڑے رہ گیا ــــ اُف اس کی ساری عمر کی پاکبازی اور نیک نیتی یوں ناانصافی اور اندھا دھند کے ہاتھوں کچل گئی ــــ مگر وہ جانتا تھا کہ خدا کو خواہ مخواہ کا اُس سے بیر نہیں، وہ ایسے صاف بچ جائے گا جیسے ــــ جیسے سب بے گناہ بچ جاتے ہیں۔ سانچ کو آنچ کہاں ــــ مگر کاش وہ شریکِ جُرم ہی رہتا۔ ــــ تو پھر وہ مجرم ہی رہتا ــــ یوں تو وہ مجرم تھا ہی آخر اُس نے پیدا ہو کر کونسا کم جُرم کیا تھا۔

ہاں تو کاش وہ شریکِ جُرم رہتا ــــ قید بھگتتا ــــ مصیبتیں دکھ درد سہتا ــــ دُنیا بھر کی ذلتیں اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ ہنس ہنس کر گود میں لپک لیتا۔ اُسے پتہ ہوتا کہ وہ یوں چھوٹے گا تو وہ کیوں گڑگڑا کر خدا کے سامنے اپنی صفائیاں پیش کر کے دعا مانگتا ــــ ہاں یہ تو تھا کہ ــــ ذرا تیل ــــ ہاں خیر! مگر خدا کیا اپنے بندوں کی کمزوری کو نہیں جانتا۔ اُسی نے یہ ساری کمزوریاں انسان کے پیچھے لگا دی ہیں ــــ مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ جب رانی سی باز پرس ہوگی اور سرکاری وکیل چاروں طرف سے چودھری کو منطق کے جال میں گھیر لے گا تو وہ یہ داؤں چلے گی ــــ اور یوں اُسے آزاد ــــ یا دوسرے معنوں میں برباد کر دے گی۔

"چودھری کا نہیں تھا ——" اُس نے بھری کچہری میں حلف اٹھا کر کہہ دیا۔

"چودھری تو ہیجڑا ہے ——" اُس نے لاپروائی سے کہا —— "رتنا سے پوچھو یا چُنّن سے —— اب مجھے کیا معلوم —— واہ" وہ اپنی پُرانی ادا سے اٹھلائی۔

ایک خاموش گرج اور چمک کے ساتھ سیاہ پہاڑ چودھری کی ہستی پر پھٹا اور دور —— سیاہی میں اور بھی سیاہ گول —— اُبھرا ہوا نقطہ پھرکی کی طرح گھومنے لگا ——!

چودھری اب بھی سڑک کے کنارے بیٹھا کوئلے سے لکیریں کاڑھا کرتا ہے۔ لمبی —— تکونی —— گول —— جیسے جلا ہوا داغ ——!

# دوزخی

جب تک کالج سر پر سوار رہا پڑھنے لکھنے سے فرصت ہی نہ ملی جو ادب کیطرف توجہ کیجاتی اور کالج سے نکل کر بس دلمیں یہی بات بیٹھ گئی کہ ہر وہ چیز جو دو سال پہلے لکھی گئی بوسیدہ ، بدمذاق اور جھوٹی ہے - نیا ادب صرف آج اور کل میں ملے گا- اِس نئے ادب نے اسقدر رگڑ بڑا یا کہ نہ جانے کتنی کتابیں صرف نام دیکھ کر ہی واہیات سمجھ کر پھینک دیں اور سب سے زیادہ بیکار کتابیں جو نظر آئیں وہ عظیم بیگ چغتائی کی تھیں "گھر کی مرغی دال برابر" والا مضمون گھر کے ہر کونے میں اُن کی کتابیں رُلتی پھرتیں - مگر سوائے امّاں اور دو ایک پُرانے فیشن کی بھابیوں کے کسی نے اٹھا کر بھی نہ دیکھیں - یہی خیال ہوتا بھلا ان میں ہوگا ہی کیا - یہ ادب نہیں پھکڑ ، مذاق ، پرانے عشق کے سڑیل قصے اور جی جلانے والی باتیں ہونگی - یعنی بے پڑھے رائے قائم - مجھے خود یقین نہیں آیا کہ میں نے عظیم بھائی کی کتابیں کیوں نہ پڑھیں - شاید اسمیں تھوڑا سا غرور بھی شامل تھا اور خود ستائی بھی - یہ خیال ہوتا تھا یہ پُرانے ہیں اور ہم نئے -

ایک دن یونہی لیٹے لیٹے اُن کا ایک مضمون "یکہ" نظر آیا میں اور عصیم پڑھنے لگے - نہ جانے کس دُھن میں تھے کہ ہنسی آنے لگی اور اسقدر آئی کہ پڑھنا دشوار ہو گیا - ہم پڑھ ہی رہے تھے کہ عظیم بھائی آ گئے اور اپنی کتاب پڑھتے دیکھ کر

کھل گئے۔ مگر ہم جیسے چڑھ گئے اور منہ بنانے لگے۔ وہ ایک ہوشیار تھے۔ بولے "لاؤ میں تمہیں سناؤں" اور یہ کہہ کر وہ ایک مضمون جو ہمیں سنائے تو صحیح معنوں میں ہم زمین پر لوٹنے لگے۔ ساری بناوٹ غائب ہو گئی۔ ایک تو اُن کے مضمون اور پھر اُن کی ہی زبانی۔ معلوم ہوتا تھا ہنسی کی چنگاریاں اُڑ رہی ہیں۔ جب وہ خوب احمق بنا چکے تو بولے :-

"تم لوگ تو کہتے ہو میرے مضمونوں میں کچھ نہیں ———" اور انہوں نے چھیڑا۔ ہمارے مُنہ اُتر کر ذرا ذرا سے نکل آئے۔ اور بے طرح چڑ گئے۔ جھنجلا کر اُلٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔ جی جل گیا اور پھر اس کے بعد اور بھی اُن کی کتابوں سے نفرت ہو گئی۔

میں نے اُن کے مضامین کی اُن کی زندگی میں کبھی تعریف نہ کی۔ حالانکہ وہ میرے مضمون دیکھ کر ایسے خوش ہوتے تھے کہ بیان نہیں۔ اسقدر پیار سے تعریف کرتے تھے۔ مگر یہاں تو اُن کی ہر بات سے چڑنے کی عادت تھی۔ میں سمجھتی تھی وہ میرا مذاق اُڑاتے ہیں اور بخدا جب وہ شخص کسی کا مذاق اڑاتا تھا تو جی چاہتا تھا بچوں کی طرح زمین پر مچل جائیں اور رو دیں۔ کسقدر طنز۔ کیسی کڑوی مسکراہٹ اور کٹتے ہوئے جملے۔ میں تو ہر وقت ڈرتی تھی کہ میرا مذاق اُڑایا اور میں نے بدزبانی کی۔

کبھی کہتے تھے کہ "مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم مجھ سے اچھا نہ لکھنے لگو" اور میں نے صرف چند مضمون لکھے تھے۔ اس لئے جی جلتا تھا کہ یہ میرا مذاق اُڑا رہے ہیں۔

اُن کے انتقال کے بعد نہ جانے کیوں مرنے والے کی چیزیں پیاری ہو گئیں۔ ان کا ایک ایک لفظ چبھنے لگا اور میں نے عمر میں پہلی دفعہ ان کی کتابیں دل لگا کر پڑھیں۔ دل لگا کر پڑھنے کی بھی خوب رہی۔ گویا دل لگانے کی بھی ضرورت تھی! دل خود بخود کھنچنے لگا۔ اُفوہ! تو یہ کچھ لکھا ہے ان رُلنے والی کتابوں میں۔ ایک ایک لفظ

اُن کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی ہے اور پل بھر میں وہ غم اور دکھ میں ڈوبی ہوئی مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی آنکھیں۔ وہ اندوہناک سیاہ گھٹاؤں کی طرح مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑے ہوئے گھنے بال وہ پیلی نیلا ہٹ لئے ہوئے بلند پیشانی، پژمردہ اُودے ہونٹ جن کے اندر قبل از وقت ٹوٹے ہوئے ناہموار دانت اور وہ لاغر سوکھے ہاتھ اور عورتوں جیسے نازک دواؤں میں بسی ہوئی لمبی انگلیوں والے ہاتھ اور پھر اُن ہاتھوں پر ورم آگیا تھا۔ پتلی پتلی کھپچی جیسی ٹانگیں جن کے سرے پر ورم سے سوجے ہوئے بدوضع پیر جن کے دیکھنے کے ڈر کی وجہ سے ہم لوگ اُن کے سرہانے ہی کی طرف جایا کرتے تھے۔ اور سوکھے ہوئے پنجرے جیسے سینے پر دھونکنی کا شبہ ہوتا تھا۔ کلیجے پر ہزاروں کیڑوں بنیانوں کی تہیں اور اس سینے میں ایسا پھڑکتا ہوا چلبلا دل! یا اللہ یہ شخص کیونکر ہنستا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بھوت ہے یا جن جو ہر خدائی طاقت سے کشتی لڑ رہا ہے۔ نہیں مانتا مسکرائے جاتا ہے۔ خدا قہار و جبار چڑھ چڑھ کر کھانسی اور دمے کے عذاب نازل کر رہا ہے۔ اور یہ دل قہقہے نہیں چھوڑتا۔ کونسا دُنیا اور دین کا دکھ تھا جو قدرت نے بچا رکھا تھا۔ مگر پھر بھی رُلا نہ سکا۔ اِس دکھ میں جلن میں ہنستے ہی نہیں ہنسائے رہنا کسی انسان کا کام نہیں۔ ماموں کہتے تھے "زندہ لاش" خدایا اگر لاشیں بھی اسقدر جاندار بے چین اور پھڑکنے والی ہوتی ہیں تو پھر دنیا ایک لاش کیوں نہیں بنجاتی۔

میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں ایک عورت بنکر اُن کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی تو دل لرز اُٹھتا تھا۔ کسقدر ڈھیٹ تھا اُن کا دل! اُسمیں کتنی جان تھی! اسمیں برگوشت نام کو نہ تھا مگر کچھ دن پہلے چہرے پر ورم آجانے سے چہرہ خوبصورت ہوگیا تھا۔ کنپٹیاں بھر گئی تھیں پچکے ہوئے گال دبیز ہوگئے تھے

ایک موت کی سی جلا چہرہ پر آئی تھی اور رنگت میں کچھ عجیب طلسمی سبزی سی آگئی تھی جیسے حنوط کی ہوئی ممی! مگر آنکھیں معلوم ہوتا تھا کسی بچے کی شریر آنکھیں جو ذرا سی بات پر ناچ اٹھتی تھیں اور پھر کبھی اُن میں نوجوان لڑکوں کی سی شوخی جاگ اٹھتی تھی۔ اور یہی آنکھیں کبھی دورے کی شدت سے گھبرا کر چیخ اٹھتیں۔ اُن کی صاف شفاف نیلی سطح گدلی زرد ہو جاتی اور پلکیں ہاتھ لرزنے لگتے۔ سینہ پھٹنے پر آجاتا۔ دورہ ختم ہوا کہ پھر وہی روشنی، پھر وہی رقص، پھر وہی چمک۔

ابھی چند دن ہوئے میں نے پہلی مرتبہ "خانم" پڑھی۔ ہیرو وہ خود نہیں۔ اُن میں اتنی جان ہی کب تھی۔ مگر وہ ہیرو اُن کے تخیل کا ہیرو ہے۔ وہ اُن کے دبے ہوئے جذبات کا تخیلی مجسمہ ہے۔ جیسے ایک لنگڑا خوابوں میں خود کو ناچتا، کودتا، دوڑتا ہوا دیکھتا ہے۔ ایسے ہی وہ مرض میں گرفتار نڈھال پڑے اپنے ہمزاد کو شرارتیں کرتا دیکھتے تھے۔ کاش ایک دفعہ اور صرف ایک دفعہ اُنکی خانم اس ہیرو کو دیکھ لیتی۔

شاید اوروں کے لیئے خانم کچھ بھی نہیں۔ لیکن سوائے لکھنے والے کے اور باقی کے سارے کیریکٹر درست اور زندہ ہیں۔ بھائی صاحب۔ بھابی جان۔ نانی اماں۔ بتنجانی۔ والد صاحب بھتیجے۔ بھنگی بہشتی۔ یہ سب کے سب ہیں اور رہیں گے۔ یہی ہوتا تھا بالکل یہی اور اب بھی سب گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کم از کم میرے گھر میں تو تھا اور ایک ایک لفظ گھر کی سچی تصویر ہے۔ جب عظیم بیگ لکھتے تھے تو سارا گھر اور ہم سب انکے لئے ایکٹنگ کیا کرتے تھے۔ ہم ہلتے جلتے کھلونے تھے اور وہ ایک نقاش جس نے بالکل اصل کی نقل کر دی۔ جتنی دفعہ خانم کو پڑھتی ہوں یہی معلوم ہوتا ہے خاندان کا گروپ دیکھتی ہوں۔ وہ بھابی جان اور خانم جھگڑ رہی ہیں۔ وہ بھائی صاحب شرارتیں ایجاد کر رہے ہیں۔ اور مصنف خود؟ سر جھکائے خاموش تصویر کشی میں مشغول ہے۔

"گھرِ پابہادر" جس کا پہلا ٹکڑا " روح لطافت " میں چھپا ہے۔ یہ سب تخیلی ہے۔ لاچار و مجبور انسان اپنے ہمزاد سے دُنیا جہان کی شرارتیں کروالیتا ہے۔ وہ خود تو دو قدم نہیں چل سکتا۔ لیکن ہمزاد چوریاں کرتا شرارتیں کرتا ہے۔ خود تو ایک اُنگلی کا بوجھ نہیں سہار سکتا۔ مگر ہمزاد جی بھر کر مار کھاتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مصنف کو ارمان تھا کہ کاش وہ بھی اتنا مضبوط ہوتا کہ دوسری بھائیوں کی طرح ڈیڑھ ڈیڑھ سو جوتے کھا کر کمر جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوتا۔ تندرست لوگ کیا جانیں ایک بیمار کے دل میں کیا کیا ارمان ہوتے ہیں۔ پر کٹا پرندہ ویسے نہیں تو خوابوں میں تو دُنیا بھر کی سیر کر آتا ہے۔ یہی حال اُن کا تھا۔ وہ جو کچھ نہ تھے افسانہ میں وہی بنکر دل کی آگ بجھا لیتے تھے۔ کچھ تو چاہیئے نا جینے کے لئے۔

شروع ہی سے روتے دھوتے پیدا ہوئے۔ روئی کے گالوں پر رکھ کر پالے گئے۔ کمزور دیکھ کر ہر ایک معاف کر دیتا۔ قوی ہیکل بھائی سر جھکا کر پٹ لیتے۔ کچھ بھی کریں والد صاحب کمزور جان کر معاف کر دیتے۔ ہر ایک دل جوئی میں لگا رہتا۔ مگر بیمار کو بیمار کہو تو اُسے خوشی کب ہوگی۔ اِن مہربانیوں سے احساس کمزوری اور بڑھتا۔ بغاوت اور بڑھتی۔ غصہ بڑھتا۔ مگر بے بس۔ سب نے اُن کے ساتھ گاندھی جی والی نان وائلنس شروع کر دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کوئی تو انہیں بھی انسان سمجھے۔ انہیں بھی کوئی ڈانٹے۔ اُنہیں بھی کوئی زندہ لوگوں میں شمار کرے۔ لہذا ایک ترکیب نکالی اور وہ یہ کہ فسادی بن گئے۔ جہاں چار آدمیوں کو لڑا دیا۔ اللہ نے دماغ دیا تھا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ بلا کا تخیل اور تیز زبان۔ چٹخارے لے لے کر کچھ ایسی ترکیبیں چلتے کہ جھگڑا ضرور ہوتا۔ بہن بھائی۔ ماں۔ باپ۔ سب کو نفرت ہوگئی۔ اچھا خاصہ گھر میدان جنگ بن گیا۔ اور سب مصیبتوں کے ذمہ دار خود۔ بس ساری خود پرستی کے جذبات مطمئن ہوگئے اور کمزور لاچار۔ ہر دم کا روگی تھیٹر کا ولین ہیرو بن گیا۔ اور کیا چاہیئے۔ ساری کمزوریاں

ہتھیار بن گئیں۔ زبان بد سے بدتر ہوگئی۔ دنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا۔ صورت سے جی متلانے لگا۔ ہنستے بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنا لینا بائیں ہاتھ کا کام ہوگیا۔

لیکن مقصد یہ تو نہ تھا کہ واقعی دنیا انہیں چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا اُن سے کھنچنا شروع کیا۔ اتنا ہی وہ لپٹے۔ آخر میں تو خدا معاف کرے اُن کی صورت دیکھکر نفرت آتی تھی۔ وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی شوہر نہ سمجھتی۔ بچے باپ نہ سمجھتے۔ بہن نے کہہ دیا تم میرے بھائی نہیں اور بھائی آواز سُن کر نفرت سے مُنہ موڑ لیتے۔ ماں کہتی "سانپ جنا تھا میں نے!"

مرنے سے پہلے قابل رحم حالت تھی۔ بہن ہو کر نہیں انسان بنکر کہتی ہوں جی چاہتا تھا جلدی سے مرچکیں۔ آنکھوں میں دم ہے مگر دل دُکھانے سے نہیں چوکتے۔ عذاب دوزخ بن گئے ہیں۔ ہزاروں کہانیوں اور افسانوں کا ہیرو ایک ولین بنکر مطمئن ہوچکا تھا۔ وہ چاہتا تھا اب بھی کوئی اُسے پیار کرے۔ بیوی پوجا کرے۔ بچے محبت سے دیکھیں، بہنیں واری جائیں اور ماں کلیجہ سے لگائے۔

ماں نے تو واقعی پھر کلیجہ سے لگا لیا۔ بھولا بھٹکا راستہ پر آن لگا۔ آخر کو ماں تھی مگر اوروں کے دل سے نفرت نہ گئی۔ یہاں تک کہ پھیپھڑے ختم ہوگئے۔ ورم بڑھ گیا۔ آنکھیں چُندھیا گئیں اور اندھوں کی طرح ٹٹولنے پر بھی راستہ نہ ملا۔ ہیرو بنکر بھی ہارا تکی ہی رہی۔ جو چاہا نہ ملا اسکے بدلے نفرت، حقارت، کراہت ملی۔ انسان کسقدر پُر ہوس ہوتا ہے۔ اتنی شہرت اور نام ہونے کے باوجود حقارت کی ٹھوکریں کھا کر جان دی۔ صبح چار بجے آج سے ۴۲ برس پہلے جو ننھا سا کمزور بچہ پیدا ہوا تھا وہ زندگی کا ناٹک کھیل چکا تھا۔ ۲۰۔ اگست کو صبح چھ بجے شمیم نے آ کر کہا "منّے بھائی ختم ہو رہے ہیں۔ اُٹھو۔"

"وہ کبھی بھی ختم نہ ہونگے ——— بیکار مجھے جگا رہے ہو ———" میں نے بگڑ کر صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پھر سو جانے کا ارادہ کیا۔

"ارے کمبخت تجھے یاد کر رہے ہیں ——" شمیم نے کچھ پریشان ہو کر ہلایا۔
"اُن سے کہہ دو اب حشر کے دن ملیں گے —— ارے شمیم وہ کبھی نہیں مر سکتے"
میں نے وثوق سے کہا۔

مگر جب میں نیچے آئی تو اُن کی زبان بند ہو چکی تھی۔ کمرہ سامان سے خالی کر دیا گیا تھا۔ سارا کوڑا، کرکٹ، کتابیں ہٹا دی گئی تھیں۔ دوا کی بوتلیں لاچاری کی تصویر بنی لڑھک رہی تھیں۔ دو ننھے بچے پریشان ہو ہو کر دروازے کو تک رہے تھے۔ بھابی انہیں زبردستی چائے پلا رہی تھیں۔ ماں پلنگ کی چادر بدل رہی تھیں۔ سوکھی سوکھی آہیں اُن کے کلیجے سے نکل رہی تھیں۔ آنسو بند تھے۔

"منّے بھائی" میں نے اُن پر جھک کر کہا۔ ایک لمحہ کو آنکھیں اپنے محور پر رکیں، ہونٹ سکڑے، اور پھر وہی نزع کی حالت طاری ہو گئی۔ ہم سب باہر بیٹھ کر چار گھنٹے تک سوکھے بے جان ہاتھوں کی جنگ دیکھتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا عزرائیل بھی پست ہو رہے ہیں۔ جنگ تھی کہ ختم ہی نہ ہوتی تھی۔

"ختم ہو گئے منّے بھائی ——" نہ جانے کس نے کہا۔
"وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے" مجھے خیال آیا۔

اور آج میں انکی کتابیں دیکھ کر کہتی ہوں ناممکن وہ کبھی نہیں مر سکتے۔ انکی جنگ اب بھی جاری ہے۔ مرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میرے لئے تو وہ مر کر ہی جئے اور نہ جانے کتنوں کے لئے وہ مرنے کے بعد پیدا ہونگے اور برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ اُنکا پیغام "دکھ سے لڑو۔ نفرت سے لڑو اور مر کر بھی لڑتے رہو" یہ کبھی نہ مر سکے گا۔ انکی باغیانہ روح کو کوئی نہیں مار سکتا۔ وہ نیک نہیں تھے۔ پارسا نہ ہوتے اگر اُنکی صحت اچھی ہوتی۔ وہ جھوٹے تھے۔ اُن کی زندگی جھوٹی تھی۔ سب سے بڑا جھوٹ تھی۔ ان کا رونا جھوٹا ہنسنا جھوٹا۔ لوگ کہتے ہیں ماں باپ کو دکھ دیا۔ بیوی کو دکھ دیا۔ بچوں کو

دکھ دیا اور سارے جگ کو دکھ دیا - وہ ایک عفریت تھے جو عذاب دنیا بنکر نازل ہوئے تھے اور اب دوزخ کے سوا اُن کا کہیں ٹھکانا نہیں - اگر دوزخ میں ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانا ہے تو ایک بار تو ضرور اس دوزخ میں جانا پڑے گا - صرف یہ دیکھنے کہ جس شخص نے دنیا کی دوزخ میں یوں ہنس ہنس کر تیر کھائے اور تیر انداز وں کو کڑوے تیل میں تلا وہ دوزخ میں عذاب نازل کرنے والوں کو کیا کچھ نہ تیر چڑھا چڑھا کر ہنس رہا ہوگا - بس میں وہ تلخ طنز سے بھری ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں - جسے دیکھکر دوزخ کا داروغہ بھی جل اُٹھتا ہوگا -

مجھے یقین ہے وہ اب بھی ہنس رہا ہوگا - کیڑے اس کی کھال کو کھا رہے ہونگے - ہڈیاں مٹی میں مل رہی ہوں گی - ملاؤں کے فتووں سے اُس کی گردن دب رہی ہوگی آروں سے اُس کا جسم چیرا جا رہا ہوگا - مگر وہ ہنس رہا ہوگا - آنکھیں شرارت سے ناچ رہی ہوں گی - نیلے مردہ ہونٹ تلخی سے ہل رہے ہوں گے - مگر کوئی اُسے رُلا نہیں سکتا -

وہ شخص جس کے پھیپھڑوں میں ناسور تھا ٹانگیں عرصہ سے اکڑی ہوئی ، باہیں انجکشنوں سے گدی ہوئی ، کولھے میں امرود برابر پھوڑا ، آخری دم اور چیونٹیاں جسم میں لگنا شروع ہوگئیں - کیا ہنس کر کہتا ہے " یہ چیونٹی صاحبہ بھی کسقدر بے صبر ہیں - یعنی قبل از وقت اپنا حصہ لینے آن پہونچیں ــــــ " یہ مرنے سے دو دن پہلے کہا - دل چاہیئے - پتھر کا کلیجہ ہو - مرتے وقت جملے کسنے کے لئے !

اُن کا ایک جملہ ہو تو لکھا جائے - ایک لفظ ہو جو یاد آئے - پوری کی پوری کتابیں ایسے ایسے چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں - دماغ تھا کہ انجن ! ہما آگ پانی کے ہر وقت چلتا رہتا تھا - اور زبان تھی کہ قینچی - اسقدر نپے تلے جملے نکالتی تھی کہ جم کر رہ جاتے تھے -

نئے لکھنے والوں کے آگے ان کی گاڑی نہیں چلی - دُنیا بدل گئی ہے خیالات

بدل گئے ہیں۔ ہم لوگ بدزبان ہیں اور منہ پھٹ۔ ہم دل دُکھتا ہے تو رو دیتے ہیں۔ سرمایہ داری، سوشل ازم اور بیکاری نے ہم لوگوں کو جھلسا دیا ہے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں دانت پیس پیس کر لکھتے ہیں۔ اپنے پوشیدہ دکھوں اُبلتے ہوئے جذبات کو زہر بنا کر اُگلتے ہیں۔ وہ بھی دکھی تھے، نادار، بیمار اور مفلس تھے۔ سرمایہ داری سے عاجز۔ مگر پھر بھی اتنی ہمّت تھی کہ زندگی کا منہ چڑا دیتے تھے۔ دُکھ میں ٹھٹھہ لگا لیتے تھے۔ وہ افسانوں ہی میں نہیں ہنستے تھے۔ زندگی کے ہر معاملہ میں ہنس کر دکھ کو نیچا کر دیتے تھے۔

باتوں کے اسقدر شوقین کہ دنیا کا کوئی انسان ہو۔ اس سے دوستی۔ گھر بار بہار میں جو شاہ لنگران کے حالات ہیں وہ ایک میراثن سے معلوم ہوئے۔ اُس سے ایسی دوستی تھی کہ بس بیٹھے ہیں اور گھنٹوں بکواس ہو رہی ہے۔ لوگ متحیر ہیں کہ یا اللہ یہ بڑھیا میراثن سے کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ مگر جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اُسی میراثن نے بتایا ہے۔

اور تو اور بھنگن، بہشتن، راہ چلتوں کو روک کر باتیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ دن ہسپتال میں رہے۔ وہاں رات کو جب خاموشی ہو جاتی۔ آپ چپکے سے سارے مریضوں کو سمیٹ کر گپیں اڑایا کرتے۔ ہزاروں قصّے سنتے اور سناتے۔ وہی قصّے "سوانہ کی روحیں"۔ "مہارانی کا خواب"، "چمکی" اور "بر بڑے" بن گئے۔ وہ ہر چیز زندگی سے لیتے تھے۔ اور زندگی میں کتنے جھوٹ ہیں۔ یہی بات ہے کہ انکی کہانیوں میں بہت سی باتیں بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں۔ چونکہ اُن کا شاعرانہ تخیل ہر بات کو یقین کرتا تھا۔

اُن کی ناولیں بعض جگہ واہیات ہیں۔ فضول سی۔ خصوصاً "کولتار" تو بالکل ردّی ہے مگر اُس میں بھی حقیقت کو اصلی صورت میں گڑبڑ کر کے لکھدیا ہے۔ "شریر بیوی" تو بالکل فضول ہے۔ مگر اپنے زمانے کی بڑی چلتی ہوئی چیز تھی۔

"چمکی" ایک دہکتا ہوا شعلہ ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اسقدر رسو کھا مارا انسان جس نے

اپنی بیوی کے علاوہ کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا تخیل میں کسقدر عیاش بن جاتا ہے۔ افوہ وہ چمکی کی خاموش نگاہوں کے پیغام۔ وہ ہیرو کا اس کی حرکتوں سے مسحور ہو جانا۔ اور پھر خود مصنف کی زندگی ـــــ کسقدر مکمل جھوٹ۔ یہ عظیم بھائی نہیں انکا ہمزاد ہوتا تھا۔ جوان کے جسم سے دور ہو کر حسن و عشق کی عیاشیاں کراتا تھا۔

عظیم بھائی کی مقبولیت یوں بھی موجودہ ادب میں یعنی بالکل نئے ادب میں نہ تھی کہ وہ کھلی باتیں نہ لکھتے تھے۔ وہ عورت کا حسن دیکھتے تھے مگر اُس کا جسم بہت کم دیکھتے تھے۔ جسم کی بناوٹ کی داستانیں پُرانی مثنویوں گل بکاؤلی، زہرِ عشق وغیرہ میں بہت نمایاں تھیں اور پھر اُنھیں پُرانی کہہ دیا گیا تھا۔ لیکن اب پھر یہ فیشن نکلا ہے کہ وہی پُرانا سینہ کا اُتار چڑھاؤ۔ پنڈلیوں کی گاؤدمی۔ رانوں کا گداز نیا ادب بنگیا ہے۔ وہ اسے عریانی سمجھتے تھے اور عریانی سے ڈرتے تھے۔ گو جذبات کی عریانی اُن کے یہاں عام ہے اور بہت غلیظ باتیں بھی لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے۔ وہ عورت کے جذبات تو عریاں دیکھتے تھے مگر خود اُسے کپڑے پہنے دیکھتے تھے۔ وہ زیادہ بے تکلفی سے مجھ سے بات نہیں کرتے تھے اور بہت بچّہ سمجھتے تھے۔ کبھی کسی جنسی مسئلہ پر تو وہ کسی سے بحث کرتے ہی نہ تھے۔ ایک دوست سے صرف اتنا کہا کہ "نئے ادیب بڑے جوشیلے ہیں۔ لیکن بھوکے ہیں اور اوپر سے اُنپر جنسی اثر بہت ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں "اماں کھانا" معلوم ہوتا ہے" وہ یہ بھی کہا کرتے کہ ہندوستانی ادب میں ہر زمانہ میں جنس بہت نمایاں رہتی ہے۔ یہاں کے لوگ جنس سے بہت متاثر ہیں۔ ہماری شاعری مصوری قدیم پرستش سے بھی جنسی بھوک کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ذرا دیر عشق و محبت کو بھول جائیں تو مقبول عام نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ادب میں اُن کا رنگ غائب ہو کر دہی "الف لیلہ" کا رنگ غالب آگیا۔

انہیں حجاب امتیاز علی سے خاص لگاؤ تھا (میں محترمہ سے معافی مانگ کر

کہوں گی کہ مرنے والے کا راز ہے) کہا کرتے تھے "یہ عورت بہت پیا رے جھوٹ بولتی ہے" انہیں شکایت تھی کہ میں بہت ہی الٹے سیدھے جھوٹ بولتی ہوں - میرے جھوٹ بھوکے کی پکار ہیں! اوران کے جھوٹ بھوکے کی مسکراہٹیں! اللہ جانے اُن کا کیا مطلب ہوتا تھا -

ہم اُن کے افسانوں کو عموماً "جھوٹ" کہا کرتے تھے - جہاں اُنھوں نے کوئی بات شروع کی اور والد صاحب مرحوم ہنسے - پھر "قصر صحرا" لکھنے لگے ؟ وہ اُن کی گپوں کو "قصر صحرا" کہتے تھے - عظیم بھائی کہتے "سرکار دنیا میں جھوٹ بغیر کوئی رنگینی نہیں! بات کو دلچسپ بنانا چاہو تو جھوٹ اسمیں ملادو"

وہ یہ بھی کہتے تھے "جنت اور دوزخ کا بیان بھی تو "قصر صحرا" ہے"

اِسپر ماموں کہتے :-

"ارے اِس زندہ لاش کو منع کرو کہ یہ کفر ہے" اِسپر وہ ماموں کے توہم پرست سُسرال والوں کا تمسخر اُڑاتے تھے -

اُنہیں پیری مریدی ڈھونگ معلوم ہوتا تھا - لیکن کہتے تھے "دنیا کا ہر ڈھونگ ایک مزے دار جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی مزے دار ہے"

کہتے تھے "میری صحت اجازت دیتی تو میں اپنے باپ کی قبر چُنوا دیتا - بس دو سال قوالی کرا دیتا اور چادر چڑھاتا - مزے سے آمدنی ہوتی ------"

انھیں دھوکہ باز اور مکار آدمی سے ملکر بڑی خوشی ہوتی تھی، کہتے تھے "دھوکہ اور مکاری مذاق نہیں - عقل چاہیئے ان چیزوں کے لئے ----"

انہیں ناچ گانے سے بڑا شوق تھا - مگر کس ناچ سے ؟ یہ جو فقیر بچے آتے ہیں اُن کا - عموماً پیسے دے کر دھول میں ناچتے ہوئے فقیروں کو اس شوق سے دیکھا کرتے تھے کہ اُن کا انہماک دیکھ کر رشک آتا تھا - نہ جانے انہیں اس ننگے بھوکے ناچ میں کیا

کیا کچھ نظر آتا تھا۔

میں نے انہیں کبھی نماز پڑھتے نہ دیکھا۔ قرآن شریف لیٹ کر پڑھتے تھے اور بے ادبی سے اسکے ساتھ ساتھ سو جاتے تھے۔ لوگوں نے ملامت کی تو اسپر کا غنڈ چڑھا کر کہدیا کرتے تھے کچھ نہیں قانونی کتاب ہے۔ جھوٹ تو خوب بھلتے تھے۔

حدیث بہت پڑھتے تھے اور لوگوں سے بحث کرنے کے لئے عجیب عجیب حدیثیں ڈھونڈھ کر حفظ کر لیتے تھے اور سُنا کر لڑا کرتے تھے۔ اُن کی حدیثوں سے لوگ بڑے عاجز تھے۔ قرآن کی آیات بھی یاد تھیں اور بے تکان حوالہ دیتے تھے۔ شک کرو تو سرہانے سے قرآن نکال کر دکھا دیتے تھے۔

یزید کے بڑے مدّاح تھے۔ اور امام حسین کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے۔ لوگوں سے گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ کہتے تھے "میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امام حسین کھڑے ہیں' اُدھر سے یزید لعین آیا آپکے پیر پکڑ لئے گڑگڑایا، ہاتھ جوڑے تو آپکا خون جوش مارنے لگا اور اُسے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بس میں نے بھی اُس دن سے یزید کی عزّت شروع کر دی۔ جنّت میں تو اُن کا ملاپ بھی ہو گیا۔ پھر ہم کیوں لڑیں ——"

سیاست سے کم دلچسپی تھی۔ کہتے تھے " بابا ہم لیڈر بن نہیں سکتے تو پھر کیا ہے، لوگ کہیں گے تم ہی کچھ کر کے دکھاؤ۔ اور یہاں کمبخت کھانسی اور دمہ نہیں چھوڑتا۔ بہت سال ہوئے کچھ مضامین ریاست میں سیاسیات اور اکنومکس پر لکھے تھے" وہ نہ جانے کیا ہوئے۔ مذہب کا جنون سا تھا۔ مگر آخر میں آکر بحث کم کر دی تھی اور کہتے تھے:۔

" بھئی تم لوگ تو ہٹے کٹے ہو اور میں مرنے والا ہوں اور جو کہیں دوزخ، جنّت سب نکل آئیں تو کیا کروں گا —— لہذا چپ ہی رہو ——" پردہ کے خلاف تو کبھی سے تھے۔ مگر آخر میں کہتے تھے" یہ پُرانی بات ہو گئی۔ اب پردہ رد کے سے نہیں رُک سکتا

اِس معاملہ میں ہم کر چکے —— اب تو نئی پریشانیاں ہیں۔" لوگ کہتے تھے دوزخ میں جاؤگے تو فرماتے "یہاں کونسی اللہ میاں نے جنت دیدی جو وہاں دوزخ کی دھمکیاں ہیں۔ کچھ پرواہ نہیں ہم تو عادی ہیں۔ اللہ میاں اگر ہمیں دوزخ میں جلائیں گے تو اُن کی لکڑی اور کوئلہ بیکار جائے گا۔ کیونکہ ہم تو ہر عذاب کے عادی ہیں ——" کبھی کہتے "اگر دوزخ میں رہے تو ہمارے جراثیم تو مر جائینگے۔ جنّت میں تو ہم سارے مولویوں کو دق میں لپیٹ لیں گے۔"

یہی وجہ ہے کہ سب اُنہیں باغی اور دوزخی کہتے ہیں۔ وہ کہیں پر بھی جائیں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کیا وہاں بھی اُن کی وہی قینچی جیسی زبان چل رہی ہے؟ کیا وہاں وہ حوروں سے عشق لڑا رہے ہیں۔ یا دوزخ کے فرشتوں کو جلا کر مسکرا رہے ہیں۔ مولویوں سے اُلجھ رہے ہیں یا دوزخ کے بھڑکتے شعلوں میں اُن کی کھانسی گونج رہی ہے۔ پھیپھڑے پھول رہے ہیں اور فرشتے اُن کے انجکشن گھونپ رہے ہیں۔ فرق ہی کیا ہے۔ ایک دوزخ سے دوسری دوزخ میں۔ دوزخی کا کیا ٹھکانا؟—

# چھوٹی آپا

کون نہیں جانتا کہ چوری بُری ہوتی ہے۔ پر بعض چوریاں ایسی مزے دار ہوتی ہیں کہ نیت بھٹک ہی جاتی ہے۔ پوشیدہ خطوط، پُرانی کتابیں، اور کاپیاں اور ہزاروں چھُپی ڈھکی چیزیں جنھیں لوگ کپڑوں کی تہوں کے نیچے چھُپا کر رکھتے ہیں، یہ چیزیں اگر ہاتھ لگ جائیں تو پھر کیا کہنے!

موسم غیر معمولی گرم اور غم آلود تھا اور یونہی چھوٹی آپا کے لکچروں سے اکتا کر میں پُرانی کتابیں ٹٹولنے لگی۔ چھوٹی آپا کتنی ہوشیار تھیں! پروفیسروں نے کسقدر اچھی رائے ان کے بارے میں دی تھی! مجھے کچھ رشک ہونے لگا، پچھلے مہینے تو پرنسپل نے کچھ مشتبہ سا جملہ میرے کارڈ پر لکھ دیا تھا۔ جسے دیکھکر چھوٹی آپا نے لکچر پلانے شروع کر دیئے۔ "وحشی ہو گئی ہو!" "احساس مر گیا ہے!" "الٹی سیدھی کتابوں نے دماغ خراب کر دیا ہے!" "تھالی کا بینگن ہو جدھر ڈھال دیکھا اُدھر لڑھک گئیں" اور نہ جانے کیا کیا۔ جی چاہا لڑ پڑوں کہ "تم کون ہوتی ہو ہمارا جو جی چاہیگا کرینگے!" ——— کہ میری نظر چند بوسیدہ کاغذوں میں اُلجھ گئی۔ اوہو چیز تو کام کی تھی چھوٹی آپا کی ڈائری!۔

بیچ بیچ میں سے کچھ صفحے غائب تھے۔ مگر ایسے نہیں کہ افسانے کو بگاڑ دیتے۔ ذرا سی محنت سے میری پیاری بھنّو کا سارا پول کھل گیا ——

پہلے ہی صفحہ پر لکھا تھا :-

۱ - آج نہ جانے کیوں جی چاہتا ہے کسی سے سر جوڑ جوڑ کر باتیں کروں! آپا جان اپنی سہیلیوں سے کیسی کھسر پھسر کرتی ہیں! کیا باتیں کرتی ہیں؟ - کیا اُن کے دل میں بھی چمکیں سی اُٹھا کرتی ہیں؟ - کیا اُن کے دماغ میں بھی ایسی میٹھی میٹھی باتیں رینگا کرتی ہیں؟ - مگر میری باتیں کون سنے گا؟ شنّو کُتیا تو ضرور ہنسے گی اور جاکر آپا جان سے جڑ دے گی - اور وہ جھٹ اماں سے کہہ دیں گی اور اماں کے پیٹ میں تو کوئی بات نہیں ٹکتی، وہ لاڈ میں آکر ابّا کو بتا دیں گی - اور پھر میرا خواب پُرزہ پُرزہ ہو کر بکھر جائیگا - نا بابا! پر آج تو کسی سے ضرور کہونگی - سب کچھ کہدوں گی - اور کسی سے نہیں تو اپنے تکیہ ہی میں منہ چھپا کر سب کچھ کہدوں گی اور برسوں کی بوسیدہ روئی میں یہ سہاؤنے سپنے ڈوب کر بس جائیں گے - پر اماں کو پرانے تکیے ادھیڑنے کی بڑی لت ہے —— پھر؟ پھر تو یہ کہانی دانہ دانہ ہو کر بکھر جائیگی - بات یہ ہوئی کہ آج میں کالے پلّے کی گردن میں ڈوری باندھ رہی تھی کہ جناب نہ جانے کدھر سے آ گئے -

" ارے یہ غریب کو کیوں پھانسی دیے جا رہی ہے؟"

میرا ہاتھ ڈھیلا ہوا تو پلا بھاگ گیا -

" اور کوئی تمہارے گلے میں رسی باندھے تو؟" اُنھوں نے لپکے میری گردن ہلا دی اور میں وہاں سے بھاگی -

مجھے چھوٹی آپا کا رومان پڑھکر سخت ہنسی آئی - مگر آگے لکھا تھا -

۲ - تو میں کیا کروں۔ بھیّا کے لئے دودھ لے جا رہی تھی کہ اُدھر سے آ گئے۔
"اب بتاؤ کدھر بھاگو گی" میرے آگے دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ برش
سے گالوں پر صابون لگا رہے تھے۔ لپکے میرے بہت سا لگا دیا۔
۳ - اماں کہتی ہیں شوکت بڑا شرمیلا ہے۔ بڑا شرمیلا! کیا آنکھیں بناتا ہے کہ
بس! اماں کو کوئی ایسی آنکھوں سے دیکھے تب پتا چلے۔ ایسا جی گھبرانے
لگتا ہے۔ رات کو گیلری میں ڈرا دیا۔
"لوگ تو ہمیں دیکھ ایسے بھاگتے ہیں جیسے ہم کھا ہی تو جائیں گے۔ اور جو ابھی
ابھی ہم ——" میں سرپٹ بھاگی وہاں سے۔ دل کیسا دھک دھک
کرنے لگا۔ جی چاہا روؤں مگر رونا نہ آیا۔ کھانے پر لیمپ کی آڑ میں بیٹھی۔ کوئی
میں کسی سے ڈرتی ہوں۔ چوہیا سے تو یوں ڈر لگتا ہے کہ کبھی وہ پھدکتی ہے
اور "اُہنیں" دیکھ کر سارے جسم میں چوہیاں سی پھدکنے لگتی ہیں۔
آج تو میں نے پانی بھی پلا دیا اور سوئیٹر بُننے کا وعدہ کر لیا۔ وعدہ کیا جی
آدھا پچھایا رات کو بُنا —— اماں کہتی ہیں اتنی رات تک بجلی جلاتی
ہوں۔ تیرہ روپے کا بجلی کا بل آیا ہے۔ اُن کی لاڈلی آپا رات رات بھر اُلٹی
سیدھی کتابیں پڑھے تو بجلی کا بل تیرہ روپے کا نہیں آتا۔
۴ - جہاں بیٹھتی ہوں آن گھستے ہیں۔ اور کیا چپکے چپکے چٹکیاں نوچتے ہیں۔ اماں
کہتی ہیں لڑکوں پاس گھس کر نہیں بیٹھا کرتے۔ مگر یہ کمبخت لڑکے
مانیں بھی۔
۵ - خالہ اماں کہتی ہیں۔ بڑی بے شرم ہوں۔ شادی بیاہ کی بات میں پٹا پٹ
بولتی ہوں۔ پھر یہ کیا بات ہے؟ کتنی دفعہ کوشش کی مگر زینہ پر سے لوٹ
لوٹ آئی۔ جو ہزار دشواریوں سے اوپر پہنچی بھی تو جلدی الماریاں ٹٹولنے

لگی جیسے کوئی چیز ڈھونڈھ رہی ہوں سچ تو ہے اپنے کھوئے ہوئے حواس ڈھونڈھ رہی تھی۔ وہ بھی کچھ نہ بولے تو بھاگی وہاں سے۔

" ذرا سنو تو ـــــــ " مگر میں کہاں، دو چار بیکار کپڑے اٹھا لئے۔

" ابھی آتی ہوں ـــــــ " اور نیچے بھاگی۔ اب نیچے اُتر آئی تو اللہ واپس کیسے چڑھوں۔ جیسے پُل صراط ہی تو چڑھنا ہے۔ زینے کے پاس چکر کاٹ رہی ہوں۔ مگر مجال نہیں جو سیڑھی پر قدم رکھوں بھنگی سیڑھیاں پونچھنے کیلئے آ گیا۔ لو چلو چھٹی ہوئی۔ پھر ہمت کی۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ طوطا بولا " مٹھو ـــ " گرتے گرتے بچی۔ باجی کہیں کا۔ اسے بلّی بھی تو نہیں کھا جاتی۔ اور پھر جو ارادہ کیا تو پیچھے اُدھر سے امّاں آ گئیں۔ میں گھبرا کر اچھے بھلے کرتے کا گریبان اُدھیڑنے لگی۔

" اری۔ یہ اچھے بھلے کرتے کا گریبان کیوں اُدھیڑ رہا ہے " وہ ایسے کُھرّے پن سے بولیں کہ جی بیٹھ گیا۔

" تنگ ہے " اور میں ایسے نوچنے لگی جیسے گریبان میرے حلق میں پڑا دم گھونٹ رہا تھا۔

" اچھا خاصا ہے۔ اب کاٹ پیٹ کر ہنڈا سا کر لینا کہ آدھا سینہ نظر آئے۔ زہر ہی لگتے ہیں مجھے یہ پھاٹک کی وضع کے گلے ـــــــ " اور وہ ناک سکیڑ کر عین سیڑھیوں کے آگے بیٹھ گئیں۔ نہ جانے ان اماں سے آبّا نے کیسے نباہ کیا۔ خوب ہوتا جو راحت خالہ سے نکاح کر لیتے! اور وہ تین سال کے لئے جا رہے ہیں۔ نہ جانے کب آئیں!۔

۶ ــ وہ چلے بھی گئے۔ امّاں نے گلے لگایا۔ آپا نے پیار کیا۔ یہ آپا کے خوب مزے ہیں۔ کیا بہانے سے رشید بھائی سے گپیں مارتی ہیں کہ حد نہیں۔ ذرا کمرے میں جاؤ

تو کود کر بھاگتی ہیں۔ نہ جانے کیا کرتے ہیں دونوں؟ اور کوئی نہیں پوچھتا
بتّو بی کتنے دانت ہیں تمہارے منہ میں !۔

۷ ۔ زندگی کے چند سادہ ورق اُلٹ رہی ہوں! مجھسے اِتنا سبق یاد نہیں ہوتا۔
ہسٹری، جغرافیہ، اور سترہ سوال۔

۸ ۔ آج محمود کے ساتھ سینما میں گئے۔ پچھلی دفعہ کا جانا یاد آگیا۔ ایک ہی موٹر میں ہم سب بھر گئے تھے۔ اُن کا ہیٹ میری گود میں رکھا تھا۔ جسے وہ بار بار تلاش کرتے تھے۔ سگریٹ کی بو پیٹرول میں مل کر کتنی عجیب ہو جاتی ہے۔ یہ محمود نہ جانے کون سے سگریٹ پیتا ہے جلے ہوئے اُپلوں جیسی بو آتی ہے۔

۹ ۔ محمود کتنا عجیب ہے ؟۔

۱۰ ۔ کھانا کھاتے میں محمود کے پَیر ساری میز کے نیچے ناچتے ہیں۔ جب دیکھو سانپ کی طرح رینگ رہے ہیں۔ اور جیسے بچارے کو معلوم ہی نہیں۔ کیا بھولا بنا سر جھکائے کھا رہا ہے۔ مگر پَیر ہیں جیسے رسّیوں کے پھندے الجھے جاتے ہیں۔

۱۱ ۔ دہلی کا سفر بھی خوب رہا۔ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے پَیر ٹوٹ گئے۔ یہاں لفٹ کیوں نہیں لگوا دیتے۔ کسقدر اندھیرا ہے کہ اللہ توبہ!۔
محمود کے پَیر ہی نہیں ہاتھ بھی رینگتے ہیں!

۱۲ ۔ اُنھوں نے عید کا تحفہ بھیجا۔ ناک میں پہننے کی کیل! ۔ اُنھیں دُنیا میں اور کوئی تحفہ نہ جُڑا۔ میری تو ناک کا سوراخ کبھی کا بند ہو گیا۔ محمود کو بہانہ ہاتھ آ گیا۔ سارا دن مجھے کاغذ کاٹنے کی مشین، بورے سینے کا سُوا اور مشین کا پیچ کش دکھا دکھا کر ناک چھیدنے کی رائے دیتا رہا۔ میں نے تو یونہی لکھا کہ بیکار ہے اور اُس نے لکھ دیا "بیکار ہے۔ کیونکہ یہ لڑکی معمولی کیل سے قابو میں نہیں آنے کی۔ اسکے لئے تو کوئی زبردست موٹی سی نکیل بھیجو"!

ایسا تحفہ بھی کیا!

۱۳ - شوکت کا خط کتنا دلچسپ ہوتا ہے - واہ واہ گویا کوئی معمہ حل کر رہے ہیں - اسقدر گول مول باتیں کہ جی اُلجھ جاتا ہے -

۱۴ - محمود کہتا ہے ایک ہفتہ میں تیرنا سکھا دوں گا - رات میں سمندر کا پانی کیسا اژدہے کی طرح پھنکاریں مارتا ہے کہ کلیجہ کھنچنے لگتا ہے - محمود کمبخت ہر وقت ڈبونے کی دھمکی دیتا رہتا ہے - سارا نیا نہانے کا لباس پھٹ گیا - نیلا آدن لانا ہے -

۱۵ - شوکت نے لکھا ہے کہ زندگی ایک گاڑی ہے - مجھے اُن موٹی بیوی کا خیال آتا ہے جو زیرہ پر چڑھنے کے لئے للچاتی ہیں - شوکت کہتے ہیں زندگی گاڑی ہے جسکے لئے دو پہیوں کی ضرورت ہے - اور وہ دو پہیئے میں اور شوکت ہیں - مجھے تو خیال سے ہی بخار چڑھ رہا ہے آتی ہیں - کیسے چلے گی یہ گاڑی - کوئی بیل ہوں - واہ -

۱۶ - کرکٹ میچ دیکھنے گئے - میرا تو دل گھبرا جاتا ہے - یہ بھی کوئی کھیل ہے - معلوم ہوتا ہے بولر ہر دفعہ میری ہی ناک کا نشانہ باندھ کر گیند پھینک رہا ہے - عسکری کی وجہ سے بیٹھنا پڑا - کمبخت کے ہاتھ کتنے سخت ہو گئے ہیں - ایسے زور سے دباتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے انگلیاں توڑ کر لیجائیگا -

۱۷ - آج عسکری کی موٹر سائیکل پر سیر ہی - محمود صاحب جلے - جلا کرو ——— جلا سے -

۱۸ - عسکری نے میرا بازو جلا دیا سگریٹ سے - اور پھر چلے علاج کرنے میں نے کہا معاف رکھئے -

بولے "سچ کہتا ہوں دو سیکنڈ میں ——— اچھا - محمود سے کہا وہ بڑا ماہر ہے" میں نے ایک تھپڑ لگایا - اسقدر ریکواس کرتا ہے - کل کھانے پر آئیگا -

۱۹ - عسکری کے ساتھ سائیکل پر سیر رہی۔ دُور تک نکل گئے۔ کبھی کبھی زندگی بھی کسقدر خوشگوار ہو جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے خود کو اُس کے بُلبلے دھارے پر چھوڑ دوں اور دنیا ساکت ہو جائے۔ کان گنگ ہو جائیں اور آنکھیں بند۔ اور کچھ نہ سُنائی دے۔ کائنات کا پتّہ پتّہ سو جائے اور صرف دو دلوں کی دھڑکن گونجتی رہے اور سب کچھ ڈوب جائے۔ نیلا رومال نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔ عسکری نے گلے میں باندھ لیا تھا۔ کسقدر بال اُڑتے ہیں۔

۲۰ - عسکری آج بھی رومال بھول آیا۔ محمود سے دو دفعہ لڑائی ہوئی۔ وہ امتحان میں فیل ہوئے تو کیا میں نے کہا تھا کہ بجائے پڑھنے کے مجھے الجبرا سکھاؤ۔

۲۱ - شوکت کی منگنی رضیہ سے ہوگی۔ کچھ دل دُکھا۔ توبہ توبہ کتنی کمبخت ہوں میں؟ وہ بچارے اب بھی نہیں کرتے تھے۔

۲۲ - عسکری جب گیند پھینکتا ہے۔ تو اسکی صورت کسقدر بر جموں جیسی ہو جاتی ہے۔ دانت بھینچکر۔ بھنویں سُکیڑ کر۔ ریشمی قمیص ساری پسینے کی وجہ سے جسم سے چپک گئی۔ مگر یہ محمود کی ناک پر کتنا پسینہ آتا ہے۔ دیکھکر ہی گھن آتی ہے۔

۲۳ - تارہ کسقدر بدمعاش ہے۔ عسکری کو دیکھتے ہی مرنے لگیں۔ عسکری جیسے انکے قصے سُن تو نہیں چکا ہے۔ اللہ کون لڑکا ہے جسپر یہ مر نہیں چکیں۔

۲۴ - دو دن سے عسکری نہیں آیا۔ پتہ نہیں۔ کہتے ہیں دہلی گیا ہے۔

انسان کتنے دن دُنیا میں رہتا ہے اور خود کو زندہ سمجھتا ہے۔ لیکن ایک جھٹکا لگتا ہے اور معلوم ہوتا ہے دُنیا کیا ہے۔ زندگی زندگی ہی سے ملتی ہے۔ جب پتھر پتھر سے ٹکراتا ہے تو آگ بھڑک اُٹھتی ہے جو جلا کر خاکستر بنا کر ہی اصل معنوں میں زرخیز بناتی ہے کہ سر سبز جنگل لہکنے لگتے ہیں۔ اور عسکری تو ایک چٹان ہے آتش فشاں۔

۲۵ - کیوں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ دنیا میں بس ایک عسکری کی نیلگوں بجھی

کیوں چھائی ہوئی ہیں۔ چھ مہینے کے دورہ پر گیا ہے۔ مگر چھ مہینے کتنے لمبے ہو گئے ہیں۔

۲۶۔ یہ مرد بھی کیسے طوطا چشم ہوتے ہیں۔ طوطے کی آنکھیں تو پھر بھی پل بھر کو ایک ہی محور پر قائم رہ جاتی ہیں۔ مگر ان کی نیلی، کالی، بھوری، اور پیلی آنکھیں تو گھومتا ہوا لٹو ہیں۔ جن کی کوئی سمت نہیں۔ ہر سمت قبلہ ہے۔

۲۷۔ دونوں خط واپس لوٹ آئے۔ عسکری شاید یورپ کے ٹور پر گیا۔ کس طرح گیند پھینکتا ہے جیسے چبا ہی توڑ ڈالے گا۔ یہ پھینکنے کی عادت بھی خوب ہے۔ لیا ــــ دبوچا ــــ اُچھالا اور پھینک دیا ــــ لیجئے پھر دوسری گیند آ گئی ہاتھ میں۔

۲۸۔ شوکت کے بیٹا پیدا ہوا۔ یعنی مجھے کیا؟ کوئی مجھ سے تھوڑی چھین لیا گیا۔ بچہ کتنا خوبصورت ہے۔

۲۹۔ پائے مرا لنگ نیست۔ ملک خدا تنگ نیست۔ محبت بھی کوئی چیز ہے جو کیڑوں کی خوراک بننے کے لئے قبروں میں سڑنے کیلئے چھوڑ دی جائے۔ عشق تو ایک بے چین شعلہ ہے کہ جب اپنا عظیم الشان رقص شروع کرتا ہے تو کائنات کو اپنے آغوش میں دبوچ لیتا ہے۔ ایک بے پناہ دریا جو اُبھرتا ہے تو بڑی بڑی چٹانوں کو چھیلتا۔ پیڑوں کو اکھیڑتا اور ریگستانوں کو ڈبوتا چلا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں عمر میں سچی محبت صرف ایک مرتبہ ہوتی ہے۔ مگر لوگو، یہ بھی تو بتاؤ وہ "ایک" ہے کون؟ انسان لٹو ہے اور اُسے ہر سمت قبلہ ہی نظر آتا ہے۔ عشق کی تو گدکا میں بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔

ایک ذرا سی محبت کی دنیا میں کتنے شوکت کتنے محمود، عباس، عسکری ــــ یونس اور نہ جانے کون کون تاش کی گڈی کی طرح پھینٹ کر بکھیر دئے گئے ہیں۔

کوئی بتاؤ اُن میں سے "چور" پتّہ کونسا ہے؟ شوکت کی بھوکی بھوکی کہانیوں سے لبریز آنکھیں۔ محمود کے سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے اعضا۔ عسکری کے بیرحم ہاتھ۔ یونس کے نچلے ہونٹ کا سیاہ تل۔ عبّاس کی کھوئی ہوئی مسکراہٹیں ——— اور ہزاروں چوڑے چکلے سینے۔ کشادہ پیشانیاں۔ گھنے گھنے بال سڈول پنڈلیاں۔ مضبوط بازو۔ سب ایک ساتھ مل کر کچے سوت کے ڈوروں کی طرح اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ پریشان ہو ہو کر اس ڈھیر کو دیکھتی ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسا سرا پکڑ کر کھینچوں کہ کھنچتا ہی چلا آئے اور میں اُس کے سہارے دُور اُفق سے بھی اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاؤں۔

---

مُڑے تُڑے پُرانے کاغذوں کے ڈھیر ایک حسین و جمیل زندگی بنکر میرے سامنے کھڑے ہو گئے اور میں حیرت سے اُن کے نقش و نگار ٹٹولنے لگی۔ چھوٹی آپا ———
چھوٹی آپا برآمدے میں بچّے کے دودھ کی بوتل صاف کر رہی تھیں۔ اور احمد بھائی اُنہیں دوستوں سے ملانے کے لئے ڈرائنگ روم میں بُلا رہے تھے۔
وہ سادہ ساڑی کے آنچل سے سر ڈھانکے صوفیانہ انداز سے صوفہ پر بیٹھ گئیں۔
"میں کہتا ہوں تم اتنی شرمیلی کیوں ہو۔ آجکل کی لڑکیاں تو مردوں کے کان کاٹتی ہیں"۔ اور وہ میری طرف طنز سے مُسکرا کر دیکھنے لگے۔ لیکن میں چھوٹی آپا کو دیکھنے میں غرق تھی۔ جو ایک تیز گھومتے ہوئے لٹّو کی طرح ساکت اب بھی کھوئی کھوئی سی نظروں سے تک رہی تھیں۔ شاید اب بھی اُن کے سامنے کچے سوت کے ڈوروں کا انبار لگا تھا اور وہ قدم تول تول کر کوئی مضبوط سرا تلاش کر رہی تھیں ———
بات کو ٹالنے کے لئے میں نے احمد بھائی کے سب سے زیادہ رنگین مزاج دوست کو چائے کی پیالی پکڑا دی۔

---

ہے تو یہ بڑی معیوب سی بات مگر میں چھپ کر بہت سی معیوب باتیں کر لیتی ہوں۔ لہذا اسی اصول کی بنا پر میں دروازے کی باریک سی جھری میں سے اکثر جھانکا کرتی ہوں۔

"یہ بہت ذلیل حرکت ہے؟" لوگ کہتے ہیں۔

"بھئی دل جو گھبراتا ہے میرا؟" میں جواب دیتی ہوں۔

میرے معقول جواب عموماً "لوگوں" کو قائل کر دیا کرتے ہیں۔ لہذا میں بلا خوف خطا جھری میں سے جھانکتی ہوں اور ان شاء اللہ جھانکتی رہوں گی۔ کون جانتا ہے!

تو میں پلنگ پر اوندھی پڑ جاتی ہوں۔ پیٹ کے نیچے ایک تکیہ دبائے بڑی جھانکا کرتی ہوں۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں کسی نئے بیاہے جوڑے کو جھانکنے کے لئے اس دلچسپ جھری کو استعمال کرتی ہوں۔ معاف کیجئے گا میں اتنی گری پڑی نہیں اور نہ میرے پڑوسی اس قسم کی بدبختوں کے قائل۔ بس تو پھر کیا اعتراض ہو سکتا ہے آپ کو؟

اس بے حقیقت جھری سے جام جم کا کام لیا جا سکتا ہے۔ ہمارے گھر کی جھریاں معمولی جھریاں نہیں۔ یہ دیدہ و دانستہ بڑی کاوشوں سے عمارت میں خصوصیت پیدا کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو ہمارے کمرے کے پاس اور

بھی کمرے خالی ہیں۔ مگر کرائے پر آپ ان میں سے ایک کمرہ لیلیں۔ میرا مطلب ہے کرائے پر، اور مزے سے جھریوں میں سے جھانکیں۔ عمارت بہت اچھی ہے۔ صرف ایک بات ہے کہ خواہ کسی وقت آپ کسی کمرے کے کسی کونے میں ہوں سورج کی کرنیں نئے نئے زاویوں سے آپکے جسم کو ابالنے کی کوشش کرتی رہیں گی۔ پھر جب آپ صبح اٹھیں گے تو ہلکا ہلکا سر میں درد، منہ کا مزہ خراب سا اور بخار کے بعد کی سی تھکن محسوس ہوگی۔ ناشتہ پر آپ کو دبی دبی اُبکائیاں آئیں گی اور پھر وہی عجیب و غریب اشیا ریگھاریں گے جن میں سے پرانے جوتوں کے اُبلنے کی سی بو آئے گی۔ آپ دروازے مقفل کر لیں گے۔ مگر درازیں؟ —— درازیں تو قائم رہیں گی۔

ہاں تو میں انہیں درازوں میں سے ایک دراز سے جھانکا کرتی ہوں۔ اللہ! کیا کیا تیری قدرت کے کرشمے ہیں!۔ سامنے ہی ایک کرسی کا پچھلا حصہ نظر آتا ہے جس پر ایک چوڑی سی تمبو کی شکل کی پتلون ہوا خوری کیا کرتی ہے۔ کبھی کبھی سفید اور کبھی بھوری، یا سرمئی، گویا یہ پتلون کرسی ہی کے استعمال کیلئے ہی بنی ہے۔ اُسکی پشت کے نچلے حصے پر دو سموسوں کی شکل کے مثلث چپکے ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے پتلون کی شکل پر کرب کی سی حالت طاری رہتی ہے۔ اس کرسی سے ذرا ہٹ کر ایک پلنگ کا پایہ نظر آتا ہے۔ اس پائے پر ایک عظیم الشان پیر کی ہیبت ناک ایڑی رکھی رہتی ہے۔ اس ایڑی کو دیکھ کر مجھے ریگستانی علاقوں کی بھیا چٹانیں یاد آجاتی ہیں۔ اس میں گہری گہری قاشیں ہیں جن میں پسینے کی ندیاں سی بہ بہ کر پائے کو سیراب کرتی ہیں۔ اور جب مکھیوں سے تنگ آ کر یہ ایڑی اپنے محور پر گھومتی ہے تو بالکل ایک چھوٹا موٹا زلزلہ سا آجاتا ہے۔ پلنگ چنگھاڑتا اور پایا جھوم جاتا ہے۔ کمبخت دراز اتنی چھوٹی ہے کہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اتنی دیر پھیلا کر

اوندھا لیٹ سکتا ہے۔ پیٹ کی نسیں اکڑ کر بائنٹے پڑنے لگتے ہیں اور میں کروٹ سے
لیٹ کر کہنی کے نیچے تکیہ سرکا لیتی ہوں۔ گردن کو تھوڑا مروڑتی ہوں اور ٹھوڑی میں
ہاتھ کی ٹیکن لگا لیتی ہوں۔ کمرے کی دنیا انگڑائی لیتی ہے اور دودھاری دار مسکین
سی ٹانگیں دکھائی دیتی ہیں۔ ان ٹانگوں کو دیکھ کر آپکے سارے مادرانہ جذبات کھول
اٹھتے ہیں۔ بے اختیار جی چاہتا ہے چپکے سے ان نیم خفتہ ٹانگوں کو لٹا دیں اور آنسو بھری
آنکھوں سے بیٹھے تکا کریں جب بہت ہی دل بے قابو ہو تو خدا کی ہزاروں نعمتوں کو
خیال میں لائیں اور ایک آہ بھر کر صبر کریں!۔ ان پیروں کے سروں میں دو سفید
اور شاعرانہ پیر مڑے ہوئے ہیں جو چنبیلی کی بڑی بڑی نیم شگفتہ کلیوں سے مشابہ
ہیں اور جن پر کنول جیسی باریک سرخ نسوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ان ٹانگوں کے
گھٹنوں پر ایک مجبور سا ہاتھ ٹہلا کرتا ہے۔ دبے پاؤں —— ڈرپوک عاشق
کی طرح کانپتا، لرزتا، جھجکتا، کبھی انگلیاں ہتیلی سے چمٹ جاتی ہیں اور کبھی
گھٹنے کی چپنی کو بھینچتی ہیں۔ ایک پُر اسرار قبرستانی سسکی ہوائیں لرزتی ہے۔

"ہلو —— ہلو —— مس رولا ؟" فضا تخ بستہ ہو جاتی ہے۔
دبی دبی آہیں اور مجروح کراہٹیں نونِ غنہ میں لپٹی ہوئی کمرے کی بالائی فضا میں
بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح تیرنے لگتی ہیں۔ گلا رندھ جاتا ہے۔ ہچکی روک کر جسم کو
دوسرے زاویہ میں کھینچتی ہوں۔ اب میرا زیریں حصۂ جسم جل مچھلی کی طرح خمدار ہو جاتا ہے
اور بالائی حصہ پیڑ کے گدھے کی طرح اکڑ جاتا ہے۔ یہ زندگی میں سب سے کٹھن بیٹھک
ہے اور بڑے سے بڑے گیانی سادھو بھی نہیں سہہ سکتے مگر میں سہتی ہوں۔ دراریں سے
جھانکنے کے لئے۔ انسان کو سبھی کچھ سہنا پڑتا ہے۔ اور اب سامنے اسٹول پر ریڈیو رکھا
رہتا ہے۔ اس ریڈیو کو شاید آپکی ساری ذہنی بیماریوں کا علم ہے۔ کیونکہ عام طور پہ
تو بازار کے بھاؤ سنا سنا کر آپکو دہلاتا ہے۔ پھر گھسے ہوئے ریکارڈ ماتم شروع کر دیتے

ہیں۔ خیر! تو اُس کے پاس ہی ایک چھوٹی سی کھانے کی میز ہے۔ جس پر سفید چادر پڑی رہتی ہے۔ یہ میز بالکل بیوہ دُلہن کی طرح اُداس اور شرمیلی معلوم ہوتی ہے۔ اسکے اردگرد بڑی شکلوں کی ہونق کرسیاں کھڑی رہتی ہیں۔ اُن کی ہیئت سے بدحواسی اور سراسیمگی بھی ظاہر ہوتی ہے اور کچھ مدقوق اور متحیّر سی لگتی ہیں۔ یہ نہیں کہ اُن کے اوپر روغن نہیں یا لکڑی گھُنی ہوئی ہے۔ نہیں، یہ تو بس دراریں سے کچھ عجیب سی نظر آتی ہیں۔ میز سے ذرا ہٹ کر ایک لمبا اور پتلا سا اسٹول رکھا ہے جس پر دو فٹ اونچا رسالوں اور اخباروں کا منارہ سا چنا ہوا ہے۔ یہ اسٹول بالکل قحط زدہ مزدور معلوم ہوتا ہے جو سرمایہ دار کی وزنی دولت کے نیچے دبا جا رہا ہو۔ اگر آپ تھوڑی دیر اس اسٹول کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھیں تو ایسا معلوم ہوگا کہ اب یہ اپنی جگہ سے ہل کر بھاگا اور اب بھاگا۔

بائیں طرف —— الماریوں کی قطاریں ہیں۔ جن میں عطار کی دکان میں سجی ہوئی بوتلوں کی طرح منوں کتابیں رکھی ہیں۔ کڑوی کڑوی دواؤں کی شکل کی ابوتری کتابیں۔ اگر آپ ذرا بھی نفیس مزاج ہیں تو آپ کو بڑے زور کی پھُریری آئیگی۔

ایک الماری کے بالائی تختے پر ایک گھڑی رکھی ہے۔ چوڑی سی موٹی عورت کے چہرے کی مانند، کُڑک مُرغی کی طرح کٹاک کٹاک کرتی رہتی ہے۔ یہ گھڑی اس مکان میں بالکل مالکۂ مکان کی حیثیت رکھتی ہے۔ جونہی دس بجے ہیں —— گائے سینگ بدلتی ہے۔ نظامِ فلکی میں تبدیلی ہوتی ہے۔ کرسی کا پتلون ایک سپاٹے سے غائب ہو جاتا ہے۔ پائے پر رکھی ہوئی لپیٹ دار کھوری ایڑی بھد سے زمین پر آن رہتی ہے کیڑوں کی جھٹک پٹک سُنائی دیتی ہے گویا فرشتے پھڑپھڑا رہے ہوں۔ پھر زمین پر جوتیاں رینگنی شروع ہوتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے پوری باٹا کمپنی کے جوتے پڑے مچل رہے ہیں۔ جوتوں کی گھس گھس سے آپکے دانت کسکسا اُٹھتے ہیں۔ جیسے ان کے درمیان

کوئی ریت کی چٹکیاں چھڑک رہا ہو۔

"ہلو ـــــ ہلو مس رنبولا؟" ایک افسردہ غنودگی میں ڈوب جاتی ہے۔ حیرت زدہ کرسیوں پر غیر مرئی صورتیں نظر آنے لگیں گی اور آپ کو پیٹھ پر ٹھنڈی ٹھنڈی انگلیاں رینگتی محسوس ہونگی۔

ان میں سے ایک صورت تو بالکل تھمے ہوئے طوفان سے مشابہ ہے۔ جیسے بادل امنڈ گھمنڈ کر آئیں اور دنیا کے گنہگاروں سے روٹھ کر وہیں تنے کے تنے رہ جائیں اور اظہار نفرت میں زخمی شیروں کی طرح غرّائیں۔ اس شکل کو دیکھ کر آپ کے دل میں بڑے بڑے آتش فشانی پہاڑوں اور خاموش تنوروں کا خیال آجائے گا جہاں پھٹنے سے پہلے لا وا کھولا کرتا ہے اور ہیبت ناک دیو کی طرح ڈکاریں مارتا ہے جیسے کسی جن کو ناحق ہرا بر ڈبیہ میں بند کر دیا ہو۔ آپکا دل بغاوت پر آمادہ ہوگا۔

دوسری شکل دیکھتے ہی آپ کا دل کسی سے لپٹ کر رو کر دل کی بھڑاس نکالنے کو چاہنے لگے گا۔ آپ کو فوراً یتیم خانوں کی بدانتظامی پر طیش آئیگا۔ اور پھر آپ فلک کج رفتار کو بددعائیں دیں گے غمگین اور دل دکھانیوالے واقعات یاد آئیں گے۔ دکھ سکھ، امیری غریبی، بیماری اور تندرستی کا مقابلہ کرنے کو جی چاہے گا۔ اور آپکا یہ بھی دل چاہے گا کہ دنیا کی ساری بڑی بڑی عمارتیں مسمار ہو جائیں، سڑکیں کھُد جائیں، کلب ڈھے پڑیں، قہوہ خانوں میں آگ لگ جائے اور سارے خوش پوش لوگ کیچڑ میں پھسل پڑیں۔ اگر آپ بہت ہی زیادہ رقیق القلب ہیں اور میری طرح غموں کو ہنس ہنس کر برداشت کرنے کے عادی ہیں تو پھر آپ ایک اور شکل دیکھنے کے لئے زندہ رہیں گے۔ چھینک آنے سے پہلے جو آثار ہوتے ہیں وہ اسپر مستقل طور پر چھائے رہتے ہیں۔ آپ سارے وقت یہی محسوس کریں گے کہ اب چھینک آئی اور اب آئی۔ کے اور یہ جو نزع کی سی کیفیت طاری ہوگئی ہے اس سے نجات ملی۔ مگر توبہ کیجئے! یہ شکل چھینک کرنیگی۔ آپ کے

اوندھے لیٹے لیٹے پیٹ میں بائنٹے پڑیں گے اور پھر درد قولنج کا مزہ آنے لگے گا مگر وہ امر چھینک اسی طرح چہرے پر تلی رہے گی۔

اور پھر کبھی کبھی ایک ادھ شکل بھی آپ کو نظر آئیگی۔ ایکدم سے آپ کو تازہ تازہ انسانی خون کی بو آئیگی اور پھر ایک نیم مقتول شکل نزع کی آخری منزلوں میں آخری قدم اٹھاتی نظر آئے گی۔ دُنیا بھر کے ہولناک قتل اور اقدام قتل کے واقعات یاد آجائیں گے۔ اس مقتول و مظلوم صورت سے صاف ظاہر ہوگا کہ وہ اپنے قاتل کی تلاش میں آئی ہے۔ مشتبہ نظریں پوچھیں گی۔

"شاید تم نے ہی تو مجھے قتل نہیں کیا؟" اور آپ کو فوراً سارا قتل کا الزام خود اپنے اوپر جمتا نظر آئے گا۔ آپکا دل چاہے گا کوئی آپ کو اسکی سزا دے۔ آپکو عذاب دوزخ کا مزہ چکھائے۔ کیونکہ اتنی دیر میں آپ خود کو قطعی مجرم گرداننے لگیں گے اور آپ کو پولیس کے خوف سے لرزہ آجائیگا۔ مگر آپ فرار نہ ہو سکیں گے۔ آپ اقبال کرلیں گے۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں یہ زندہ ممی بالکل ایک ملکوتی شے معلوم ہوگی آنکھیں دیکھ کر آپکا کلیجہ ہل جائے گا۔ معلوم ہوگا یہ رونے کے تمام پرانے ریکارڈ توڑ چکی ہیں۔ اور پھر یہ شکل بھی انہیں ہولق کرسیوں پر بیٹھ جائیگی۔ مگر ایسے کہ اگر آپ چھونا چاہیں تو آپ کا ہاتھ خلا میں لٹکا رہ جائے گا! اوہ معبودا۔

ہاں ایک بات ہوگی اردو یہ کہ وہ پائے والی ہیبت ناک ایڑی آپ اس صورت کے سر نہیں تھوپ سکتے۔ اب آپ کے دل کی دھڑکن غیر مطمئن ہوجائیگی۔ بلا وجہ آپ کو بے بات کا پچھتاوا سا شروع ہوگا۔ پھر معلوم ہوگا کمرے میں روحوں کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ اور وہ سب کی سب ملکر زندہ لوگوں کے خلاف سازشیں کر رہی ہیں۔ غمزدہ گیت اور غزلیں یاد آنے لگیں گی ——— ہلکا ہلکا المناک نغمہ فضا میں لہرائے گا۔ جیسے قبرستان میں مُردوں کے کفن سرسرا رہے ہوں۔ بے رنگ و بُو

خون کے چھینٹے ہوا میں گھُل مل جائیں گے۔ آپ کو اپنے سارے مُردہ رشتہ دار اپنے ارد گرد کراہتے، لرزتے محسوس ہوں گے اور بے ساختہ مقدس الفاظ لبوں پر منڈلانے لگیں گے اور پھر آپ سُنیں گے "میرے لئے جہاں میں — چین ہے نا — قرار —"

اوہ! دل میں ایک ہوک اُٹھے گی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئیں گے۔ نیچے کا ہونٹ لرزے گا — چہرے کی باقی ماندہ نسیں مختلف سمتوں میں کھنچنے لگیں گی۔ گلے میں کونین کی سی گولیاں اٹکیں گی۔ دبی ہوئی سسکیاں اُبھرتی محسوس ہونگی جنہیں دبانے کے لئے آپ کو مجبوراً چھوڑے کے پاس سے ہٹنا گا۔ وہی ننھی سی بے حقیقت چھوڑ جس میں سے اکثر جھانکا کرتی ہوں!۔

# ایک شوہر کی خاطر

اور یہ سب کچھ بس ذرا سی بات پر ہوا مصیبت آتی ہے تو کہہ کر نہیں آتی۔ پتہ نہیں وہ کونسی گھڑی تھی کہ ریل میں قدم رکھا کہ اچھی بھلی زندگی مصیبت ہو گئی۔ بات یہ ہوئی کہ اگلے نومبر میں جودھپور سے بمبئی آ رہی تھی۔ سب نے کہا "دیکھو بچیا ڈوگی مت جاؤ"۔ مگر جب چیونٹی کے پر نکلتے ہیں تو موت ہی آتی ہے۔

سفر لمبا اور ریل زیادہ ہلنے والی۔ نیند و را اور ریت کے جھپکے، اوپر سے تنہائی، سارا کا سارا ڈبہ خالی پڑا تھا جیسے قبرستان میں لمبی لمبی قبریں ہوں۔ دل گھبرانے لگا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے تنگ آ گئی۔ دوسرا لیا اُس میں بھی وہی خبریں! دل ٹوٹ گیا۔ کاش میں قبرستان میں ہوتی۔ بلا سے مُردے ہی نکل پڑتے۔ بچوں کو دیکھ دیکھ کر جی ہول رہا تھا۔ "کاش کوئی آ جائے ــــ کاش ــــ کاش ــــ" میں نے دعا مانگنی شروع کی۔

ایکدم سے ریل جو رُکی تو ایکدم سے جیسے ٹیڑیاں ٹوٹ پڑیں۔ انسان تو کم آئے بچّے اور پٹلیاں زیادہ ـ بچّے ایسے جو قحط زدہ گاؤں سے آ رہے تھے کہ آتے ہی خوراک پر پل پڑے۔ دودھ پینے والوں کو تو خیر تیار معاملہ مل گیا اور وہ جُٹ گئے۔ باقی کے تلملانے اور تڑپنے لگے۔ پٹلیاں اِسقدر بے ہنگم اور فضول جگہ گھیرنے والی وضع سے بندھی تھیں کہ

کسی کل بیٹھتی ہی نہ تھیں۔ ایک سنبھالی تو دوسری تیاری میں علیحدہ پٹری پر اِس زاویہ سے بیٹھی تھی کہ گٹھری گرے تو میری ریڑھ کی ہڈی بچ جائے۔ مجھے اپنے جسم میں ریڑھ کی ہڈی سب سے زیادہ عزیز ہے۔ کہتے ہیں ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے تو آدمی لوتھڑا ہو جاتا ہے۔

"کہاں جا رہی ہو؟ ـــــ" بیچاری مسافر نے گٹھریوں کی طرف سے غیر مطمئن ہوتے ہوئے بھی نہایت فکرمند ہو کر پوچھا۔ میں نے جلدی سے بتایا اور پھر اُن کی توجہ اُس بجی گٹھری کی طرف منعطف کی جو شاید برتنوں کی تھی اور ذرا سی ٹھیس سے گرنے کو تیار تھی۔ اگر اتفاقیہ ذرا ہاتھ لگ جاتا تو برتن اِس تیزی سے آپس میں ٹکرا کے جی کھرا اُٹھتا۔

"کہاں سے آ رہی ہو ـــــ؟" میں نے ذرا کم مستعدی سے بتایا۔

"میکے جا رہی ہو؟" جب تک شادی نہ ہوئی ہو تب تک جگت میکہ ہی ہے اور کہیں بھی نہیں۔ یعنی میکہ اور سسرال کا سوال ہی نہیں۔ لہٰذا میں چکرائی۔ سوچا اندازاً کس صوبہ میں شادی ہونے کا خطرہ ہے۔

"میاں کے پاس جا رہی ہو؟"

"نہیں!" میں نے چاہا موضوع بدل جاتا تو اچھا ہوتا۔ خواہ مخواہ کوئی ہمدردی وصول کرے۔

"تو پھر سسرال جا رہی ہو گی ـــــ کیوں؟" ذرا اِن سوالوں کے جواب بہت فلسفیانہ ہوتے ہیں۔

"نہیں ـــــ تو ـــــ میں بمبئی جا رہی ہوں ـــــ شادی ـــــ شادی تو نہیں ہوئی" میں نے ذرا دل میں کچھ حقیر ہو کر کہا۔ حالانکہ شادی کے خلاف کالج کے مباحثہ میں مجھے اوّل انعام ملا تھا۔ اور اب بھی ـــــ خیر اب تو ـــــ

ہاں تو میں نے کہا۔ وہ متحیّر ہوکر اتنی زور سے اُچھلیں کہ بچّے کے منہ سے دودھ چھوٹ گیا اور وہ مذبوحہ بکری کی طرح چیخا۔ میں نے دھیان بٹانے کو اُن کی توجہ بچّے کی طرف کرنا چاہی۔ مگر وہ ٹٹول ٹٹول کر بچّے کی ناک میں دودھ ٹھونسنے لگیں اور میں یہاں لکھنا نہیں چاہتی کہ مجھے اُنہوں نے کس رحم اور مہربانی بھری نظروں سے دیکھا۔ اُنہیں مجھ پر محبّت سی آنے لگی۔ اور میں ڈری کہ وہ کہیں مجھے چمٹا کر رو نہ پڑیں۔ اُن کا دل بہلانے کے لئے میں نے چنے والے کو بلایا۔ مگر وہ ویسی ہی اُداس رہیں۔ اُنہوں نے مجھے دو ایک داؤں پیچ ایک اچھا سا شوہر پھانسنے کے بتلائے جو بعد میں تجربہ سے قطعی بیکار ثابت ہوئے۔

میری دعا شاید ضرورت سے زیادہ قبول ہوگئی۔ یا شاید میری خدا کے حضور میں کاتبین کی غلطی سے دوبارہ عرضی پیش ہوگئی۔ کہ ایک فوج انسانوں کی پھر آئی۔ اِس فوج میں بڑے بڑے ریشمی بُرقع اور چھتریاں زائد تعداد میں تھیں۔ اُنکے ساتھ کئی بچّے بھی تھے۔ جنکے ٹکڑے ناپ ناپ کر اتنے بڑے کاٹے گئے تھے کہ ریل کے کسی کونے میں ٹھیک سے نہ رکھے جاسکیں۔ اُن کے بستر اور صندوق بھی کچھ ایسے تھے جو کسی پٹری کے اوپر یا نیچے کسی انداز سے بھی نہ رکھے جاسکتے تھے۔ اِن بیویوں نے آتے ہی ریل میں ہلا چلی مچادی۔ صندوق اور پلندے گھسیٹ کر تباہ کردیئے۔ پہلے والی مسافرہ کی ضدّی پوٹلیاں جو شاید تاک میں تھیں بچّوں اور عورتوں پر گریں اور وہ سب ایک دوسرے پر گرے۔

"کہاں جارہی ہو؟" یہ بھی کچھ پریشان تھیں۔

بتایا۔

"کہاں سے آرہی ہو ———؟" بولیں۔ حالانکہ ابھی ٹھیک سے جمی بھی نہ تھیں۔ بُرقع پھانسی لگا رہا تھا۔ مگر بتایا

"میکے جا رہی ہو یا سسرال؟" کاش مجھے معلوم ہوتا۔ مگر چوکنے کا موقع نہ تھا۔
"سسرال!" ایسے کہا کہ وہ ہمسفر جو پہلے جرح کر چکی تھیں نہ سن پائیں۔
"کیا کرتے ہیں میاں؟" اب میں نے سوچا کچھ تو کرتے ہی ہوں گے۔ بیکار تو کاہے کو پھرتے ہوں گے۔ مگر کاش وہ مجھے یہ بھی بتا دیتے تو اچھا ہی تھا۔ بہر حال نکھٹو تو نہ ہوں گے۔ پر — وہ خود ہی بولیں:۔
"ریلوے میں ہیں —"
"ہاں — ہاں —" میں نے پرشوق لہجہ سے انہیں یقین دلایا۔ یہ "ٹھیک رہا۔ میں نے سوچا۔ ریلوے کا آدمی خوب رہے گا مزہ سے مفت کے ٹکٹ تو ملیں گے۔ ہندوستان بھر میں گھوم لو۔ اور مجھے وردی بھی ان کمبختوں کی پسند ہے۔ خصوصاً وہ ٹوپی اور سیٹی۔ لال ہری جھنڈی۔ اچھا ہی ہوا جو یہ بیچاری مل گئیں۔ ورنہ اپنے کو تو کبھی گارڈ، بابو وغیرہ کا خیال بھی نہیں آیا —
اے ہاں سچ تو ہے۔
"کون کام پہ ہیں — وہ ریل میں؟"
"کسی ٹھیک ہی کام پہ ہوں گے — اور کیا" مجھے خیال ہی نہ آیا کہ گارڈ یا بابو کی بیوی بننا آسان ہے مگر یہ تفصیل تو ذرا بھاری خوراک ہے۔
"پھر بھی — کیا کام کرتے ہیں؟ ریل میں تو ہزار ہا طرح کے کام ہیں —"
"اے ... سیٹی — قلی —" میں ایسی بولائی کہ کچھ بن نہ پڑا۔
سامنے ایک قلی بڑا سا ہینڈل، ایک بستر، آدھی درجن صراحیوں کی سیڑھی اور دو لوٹے لئے چلا آ رہا تھا اور ایسا بن رہا تھا جیسے بہت بھاری ہیں۔
"قلی — تمہارا میاں قلی ہے —" حیرت کا ایک دورہ ان پر

بھی پڑا۔ میں چاہتی تھی کہ ذرا ہم آہستہ آہستہ گفتگو کریں ورنہ کہیں پہلی ہم سفر سُن نہ لیں۔ اُن کا بچہ سکون سے دودھ پی رہا تھا۔ مگر ایک دفعہ بات مُنہ سے نکل جائے تو پھر میں بھی اسپر ہی جم جاتی ہوں اور یہاں تو جھنے کے ویسے ہی لالے پڑے تھے۔

"ہاں ——— آپ قلی ہی سہی پھر تمہیں کیا؟" میں نے ذرا اِترا ان کر کہا۔

"تمہارا میں ——— میاں قلی ———"

"ہاں پھر ——— تم کیوں جلو ——— تمہارا جی چاہے بہن تم بھی قلی سے کر لو ——— دس قلیوں سے کرو کون روکتا ہے۔ اتنے سستے ہیں قلی" مگر میں ذرا چُپ رہی اور مظلوم سی صورت بنالی۔

بولیں "کیسے ہو گئی تمہاری شادی قلی سے؟" اور میں سوچنے لگی قلیوں سے کس طرح شادیاں ہوتی ہیں۔ میں نے چاہا دل سے کچھ گڑھوں کسی قلی کی شادی کا حال مگر وہ اسقدر غیر دلچسپ معلوم ہوا۔ پھر میں نے کہا۔

"ایک قلی تھا ———"

اُنہوں نے توجہ سے سُنا۔

"وہ رہا کرتا تھا ———" میں چاہتی تھی وہ میری ہر بات پر "ہوں" کریں یا کم از کم سر ہلائیں۔

"پھر کیا ہوا کہ ایکدن ——— کہ ———" کاش مجھے معلوم ہوتا۔ اِسوقت کوئی قصہ بھی تو نہ یاد آیا۔

"وہ لیجا رہا تھا سامان ———" میں نے چاہا وہ پوچھیں کس کا "اور انہوں نے پوچھا۔

"ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی کا ——— پھر وہ لڑکی ——— وہ لڑکی

عاشق ہوگی ——"

"کون لڑکی ؟" "ارے یہ تو معلوم ہی نہیں پڑا خیر کیا مضائقہ ہے۔ کوئی بات نہیں۔ یقیناً ہوگی ہی کوئی لڑکی۔ کوئی خوبصورت سی لڑکی ہوگی۔

"تو وہ قلی پہ کیوں عاشق ہوگی —— ؟"

"وہ عاشق یوں ہوگی کہ —— کہ —— اجی بھئی اب یہ کیا معلوم کوئی تو وجہ ہے ہی عاشق ہونے کی۔ وہ مسکرایا ہوگا اسے دیکھ کر —— ؟ اتنے میں ایک نہایت بھیانک قسم کا بابو مجھے دیکھ کر مسکرایا اور میں ڈری کہ کہیں سچ مچ عاشق نہ ہونا پڑے۔ ابھی انٹرویو میں جانا ہے۔ سنتے ہیں عشق میں بڑی خراب حالت ہو جاتی ہے۔ بھلا پردیس میں کہاں عاشق ہوتی پھروں گی۔ ویسے ہی جسیم بھائی کے یہاں جانا ہے اور وہ ہیضہ کے بعد بس عشق سے گھبراتے ہیں۔ خیر بات گئی گذری ہوگئی۔

"اے بہنا! یہ کیا کہہ رہی ہو ؟ —— کون لڑکی، کس کا عشق۔ میں کہتی ہوں تمہاری شادی کیسے ہوئی —— ؟"

"ہاں —— ان کی بچاری کی شادی نہیں ہوئی ——" آخر کو پہلی مسافرہ کو پتہ چل ہی گیا نا۔ کتنا ہمدردی سے کہا آہستہ بول آہستہ۔ مگر —— یہ لیجئے وہ قلی بھی ہاتھ سے گیا۔

"جب نہیں ہوئی تھی ——" میں نے چاہا شاید بات بن جائیں۔

"اوئی —— تو کیا ریل میں بیٹھے بیٹھے ہوگئی" کاش ایسا ہو سکتا۔ کاش گرما گرم چائے کے بجائے لوگ امیر امیر کما ؤ شوہر بیچتے ہوتے۔ تو سفر کے لئے تو میں ضرور لے لیتی۔ پھر چاہے —— پھر دیکھا جاتا۔ اور میں نے ارادہ کر لیا کہ ایک مناسب قسم کا میاں ڈھونڈنا چاہیئے۔ ایسا بھی کیا ٹوٹا ہے اپنا —— ٹھیک ہی رہے گا۔ بلا سے ہر مسافر سے نئے نئے جھوٹ تو نہ بولنے پڑیں گے کہ کبھی کسی کے

پوچھا فوراً میاں حاضر۔

"ارے بھئی اچھے لڑکے کہاں ملتے ہیں" وہ میرے مستقبل سے ناامید ہو کر بولیں "موٹر مانگتے ہیں۔ گاڑی گھوڑا دو ——— اور بھئی کماؤ ہوں جبھی نا ——— ایسے مل جاتے ہیں کماؤ لڑکے"

میں رنجیدہ ہو گئی۔ آخر یہ لڑکے کماؤ کیوں نہیں ہوتے ——— کمبخت اچھے لڑکے پہلے زمانے میں کتنے ہوتے تھے۔ مولی گاجر کی طرح۔ پر اب چاہو کر آنکھ میں لگانے کے لئے اچھا لڑکا مل جائے تو نہیں۔ اس لڑائی نے تو اور اجاڑ کر رکھ دیا۔ چلو بھئی پہلے لڑکے تو تھے کماؤ تھے یا نکھٹو۔ پر اب تو جسے دیکھو لڑائی پر چلا جا رہا ہے۔ لو صاحب یہاں تو بیویاں طعنے دے رہی ہیں اور لڑکے ہیں کہ مرنے کٹنے پر تلے ہوئے ہیں۔

"تم پھر شادی کیوں نہیں کر لیتیں ———" ایک بولیں۔

"جیسے آپ کی مرضی" میں نے اس معصوم لڑکی کی طرح کہا جس سے والدین شادی طے کرنے کے بعد روشن خیال بننے کے لئے رائے لیتے ہیں۔

"کب کرو گی پھر اب نہیں کرو گی تو ؟"

"اب ——— یعنی ابھی ——— میرے خیال میں ——— تو ——— اگر جنکشن تک ٹھہر جاتے تو اچھا تھا ———"

"کیا ؟"

"یہی کہ ——— جب آپ کی مرضی ہے تو پھر کیوں اس نیک کام میں دیر کی جائے ———"

"کیسا نیک کام ؟ کیا کہہ رہی ہے لڑکی ؟" بہت ہی گھبرا گئیں۔

"میں نے پوچھا بھئی شادی کیوں نہیں کرتیں تم ———" دوسری بولیں

"تم کیوں نہیں کرتیں شادی ——— بس ؟" میں اب کافی جل گئی

تھی۔ حالانکہ اُن کا بچہ مُسلسل دودھ پی رہا تھا۔ مگر میں نے اُسے نظر انداز کر دیا۔

"اُدئی —— معلوم ہوتا ہے کچھ دماغ بھی خراب ہے ——" وہ بچّہ کو اور واضح طور پر سامنے لائیں تاکہ یہ نہ معلوم ہو کہ وہ صرف گود میں سو رہا ہے۔

"تو —— اچھا تو تمہاری شادی ہو گئی —— کب کی تم نے شادی ——" میں نے بہت بے تکلفی سے پوچھا۔

"ہمارے ماں باپ نے کی ہماری شادی، ہم خود کیوں کرتے ——"

"تو آپ شادی کے خلاف ہیں —— ٹھیک ہے —— بالکل ٹھیک۔ میرے بھی ماں باپ نے شادی کی —— جاہل انسان!" اسکے بعد وہ کچھ مکدّر سی ہو گئیں اور غمگین ہو کر ناشتہ دان میں سے امرتیاں نکالکر غم غلط کرنے لگیں۔

ایخدا! تو جب دعائیں قبول کرنے پر آتا ہے تو یوں دعا قبول کرتا ہے؟۔ تیرے بندوں کو کسی کل چین نہیں۔ یہ تیری ناچیز بندی تنہا تھی۔ اُس نے دوسرا بہت چاہی تو تو نے یوں عذاب کی طرح مسافر نازل کرنا شروع کئے!۔ اور مسافروں سے زیادہ اسباب۔ ویسے بھئی ہمیں کیا حق کہ بے بات تیری مصلحت میں دخیل ہوں مگر پروردگار اتنا تو سوچا ہوتا کہ انسان میں تو نے جتنی برداشت دی ہے اتنا ہی بوجھ لاد۔ کہتے ہیں ہم تو بس۔

اور میں دل میں ڈری کہ اگر دعاؤں کے قبول ہونے کا یہی ڈھنگ رہا، تو کہیں وہ شوہر کے لئے جو ابھی ابھی دعا مانگی تھی اُس کا بھی کچھ ایسا ہی قصہ ہو جائے اور رے چلا چل ایک پہ ایک! میرا تو دم ٹوٹ جائیگا!۔ میں ایک کے ہی قمیص میں بٹن لگا دوں اور چائے بنا دوں تو بہت جانو۔ مجھ سے بھلا اتنے کاہے کو جھیلے جائیں گے۔ سُست مٹی ویسے ہی ہوں۔ اب اتنے میاؤں کو کون میرے بیٹھ کے ٹھُنگنے کا۔ کہتے ہیں کہ ڈاک خانہ میں اگر بھولے سے کوئی غلط خط پڑ جائے تو تھوڑی سی رشوت دیکر

واپس لے سکتے ہیں۔ کاش دعاؤں کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی انتظام ہوتا۔ مگر دعا ایک دفعہ مانگی جا چکی تھی اور پے در پے قبول ہو رہی تھی۔

نئی ہمسفر بہت ہی خلیق معلوم ہوتی تھیں اور ضرورت سے زیادہ رقیق القلب! کچھ نازک سی شاعرانہ بیماری۔ کچھ آہستہ بولنے کی عادی۔ مجھے اُن پر بے بات پیار آنے لگا۔

"حیدرآباد جا رہی ہیں آپ ——" اُنہوں نے بڑے وثوق سے پوچھا۔ میں ڈری کہ انکار کروں گی تو خفا ہو جائیں گی۔ لہذا بڑی عاجزی سے انکار کیا اور بتایا کہ بمبئی جا رہی ہوں۔

"احمد آباد سے آئی ہونگی ——" کس ہوشیاری سے وہ پُرانی بوتلوں میں نئی دوا بھر بھر کر سر سہلا سہلا کر پلا رہی تھیں۔ مگر اُن کا چہرہ اسقدر رویا ہوا تھا کہ دل دکھانے کی ہمت نہ پڑی۔ میں نے بتایا۔

"پڑھتی ہیں وہاں ——"

"جی نہیں، انٹرویو کے لئے جا رہی ہوں ——"

"میرے ایک چچا کے سالے کی خالہ بھی بمبئی میں رہتی ہیں —— اُن سے ملئے گا ——"

میں نے وعدہ کر لیا۔ بھلا میں کہاں اُن کے چچا کے سالے کی خالاؤں کو ڈھونڈتی پھرتی!

"وہاں آپ کے والد والدہ ہیں ——"

"نہیں —— میرے ......" بولنے ہی نہ دیا خود بولیں۔

"اچھا آپ کے شوہر ہوں گے!" گھُن! وہ دیکھئے گھما پھرا کر وہی ایک ٹانگ مرغے کی۔ شوہر۔ شوہر۔ ہندوستان کے شوہر اسقدر مرکھنے۔ نا کیں

کاٹ لیں، طلاقیں دیدیں، بڑی مشکل سے ملیں، اور ملیں تو نکھٹو! رنڈی بازی کریں، جوا کھیلیں، مگر بیویاں ہیں کہ واری جارہی ہیں۔ جسے دیکھئے شوہر کے ذکر میں غلطاں، جسے دیکھئے اپنے یا پرائے شوہر کا رونا رو رہی ہے۔ کنواریاں ہیں تو شوہر کے گیت گا رہی ہیں، بیاہیاں ہیں تو پریتم پر فدا۔ اور یہ پریتم کتنے خون تھکوائے دے رہے ہیں۔ اِن مظالمِ معشوقانہ پر تو یہ حال ہے۔ اگر ذرا لاڈ کر لیتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میں نے سوچا میاؤں کے ظلم میں بھی کچھ مصلحت ہے۔

"کہاں رہتی ہیں آپ بمبئی میں —— کتنے بچے ہیں آپ کے ——"

میں تو سوچ میں پڑی تھی اور وہ میاں کے بعد بچوں کی تعداد پر اتر آئیں۔

"آٹھ ——" میں نے پلیٹ فارم پر کتے گنتے ہوئے کہا۔ یہ ریلوں کے ساتھ مسافروں سے زیادہ کتے کہاں سے آتے ہیں!

"آٹھ؟"

"ہاں —— کیوں، آپ کیوں برا مانتی ہیں؟ یقین نہ آئے تو اتر کر گن لیجیے!"

"اب میں راستہ میں کیسے اتروں —— ہاں انشاء اللہ کبھی آنا ہوا میرے چچا کے سالے کی خالہ کے یہاں تو —— خیر —— مگر بہن! معلوم تو نہیں ہوتا منہ سے ——"

"منہ سے معلوم ہی کیا ہوتا ہے؟" میں نے فلسفیوں کے انداز میں کہا۔ جب دنیا سے مجھے نفرت ہونے لگتی ہے اور ہر چیز نیم مردہ اور اداس لگنے لگتی ہے تو میرے دماغ میں فلسفہ بھرنے لگتا ہے۔

"شادی کو کتنے برس ہوئے ——" انہوں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"چار برس تین مہینے اور ——"

"اور آٹھ بچے؟ —— اے بہن میں سمجھی تھی چلو ہوں گے —— مگر"

وہ بہت غمزدہ سی ہوگئیں۔ مجھے رحم آگیا۔ مگر میں نے تہیہ کر لیا کہ کچھ ہو جائے اب اور نہیں دبوں گی۔ ورنہ بچوں کے بعد یہ تو اسے پوتے بھی میرے سر منڈھ دیں گی اور وہ بیویاں جو میرے حال زار سے واقف ہیں او نگھ نہ چکیں پھر خواہ مخواہ کی لے دے پڑے گی۔ آٹھ بچوں سے ویسے ہی روح قبض ہوئی جا رہی تھی۔

"ہاں ہاں کہتی تو ہوں ——— آٹھ ———"

"ماشاءاللہ سب زندہ ہیں ——— مگر بہن یہ ہوئے کیسے؟"

"کیسے ہوتے۔ جیسے دنیا جہان میں ہوتے ہیں ویسے ہی ہوئے ہونگے"

"میرا مطلب ہے ——— چار سال میں ———"

"ہاں میں سمجھی ——— اچھا یہ معلوم کرنا چاہتی ہیں آپ تو ——— یہ ہوا کہ کبھی دو، کبھی تین ——— اور ———"

"ہے ہے" وہ لرزیں۔ اور مجھے بُرا لگا کہ آخر یہ کون ہوتی ہیں بُرا ماننے والی یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آخر انہیں کیا۔ چاہے کوئی ایک بچہ دے چاہے درجن۔ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ پچھلی ملاقاتی جاگ اٹھی۔

"سنا بہن! ان کے دو دو، تین تین ساتھ ہوئے ——— بچے" انھوں نے شکایت کی اور وہ گھبرا کر اپنے بچے گننے لگیں۔ کیونکہ سوائے بچوں کے انھوں نے کچھ نہیں سنا۔

"کیا قصہ ہے؟" دوسری بولیں۔ جب معاملہ خوب سمجھا دیا گیا تو تینوں بگڑ کھڑی ہوئیں۔

"ابھی کہتی تھیں شادی نہیں ہوئی اور ابھی دو دو تین تین بچے ہونے لگے" ایک نے ڈانٹا۔

"میری کیوں نہ ہوتی شادی خدا نہ کرے۔ تمہاری ہی نہیں ہوئی ہوگی۔"
—— بات بگڑنے لگی۔ پاس سے ایک ٹکٹ چیکر گذرے۔ یا جانے کون تھے۔ مجھے تو ہر ریل کا نوکر ٹکٹ چیکر ہی سا لگتا ہے۔ میں نے جھک کر اُن سے وقت پوچھا۔ وہ بتانے کے بعد مسکرانے لگے اور مسکراتے ہوئے چلدیئے۔

"تم تو کہتی تھیں اکیلی جا رہی ہوں؟ —— اور یہ تمہارے ——"

"یہ میرا نواسہ ہے ——" قبل اسکے کہ وہ کوئی رومنٹک سا رشتہ قائم کرتیں میں نے خود ہی اپنے لئے فیصلہ کر لیا۔

"نواسہ؟" تینوں چیخیں!۔

اللہ! یہ آج اِن لوگوں کو مجھ سے کہاں کا بَیر پڑ گیا تھا کہ میرے کنبے کے ہر فرد کے ذکر پر بن بن کر چونک رہی تھیں۔

"کیا کہتی ہے لڑکی —— یہ تیرا نواسہ کہ ——"

"تو آپ کو کیا؟"

"بہن! بال تو سفید رکھے تھے اُن کے ——" دوسری بولیں۔

"نزلے سے ہوگئے ہونگے" میں بڑبڑائی۔

اور پھر میں بالکل کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ خودکشی کو دل نہ چاہا۔ چلتی ریل سے اُترنے کی پریکٹس نہ کی۔ زمین سخت اور آسماں دور۔

---

ہونہار بات ہوکر رہتی ہے۔ جب زائد سامان تُلوا کر بلٹی دینے لگا تو کلرک نے کہا "آپکا نام —— شوہر کا نام ——؟"

"چُغدا!" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"چُغدے؟ —— کیا اونڈا نام ہے ——!" اس نے متعجب ہوکر کلرک کے

کہنی ماری۔

یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ جب اُس نے مجھے مسز چوکھے بنا کر رسید دی تو میں نے اُس کے مُنہ پر اپنا بٹوہ مع ایک عدد موٹی کتاب کے کھینچ مارا اور یہ سب کچھ ہوا بس ایک شوہر کی خاطر!۔

# عورت اور مرد

## افراد ڈرامہ

زبیدہ ۔ پڑھی لکھی ۔ مگر فرمانبردار اور ڈرپوک لڑکی ۔
رشید ۔ زبیدہ کا شیدائی ۔
محمود ۔ رشید کا بچپن کا دوست ۔
جج صاحب ۔ پنشن یافتہ رئیس ۔ زبیدہ کے والد ۔ سَر کے خطاب سے سرفراز ۔
بیگم ۔ اُن کی بیوی ۔
نیاز ۔ جج صاحب کے چھوٹے بھائی ۔

---

(زبیدہ غمگین بیٹھی جو گیا کا خیال گنگنا رہی ہے ۔ کوئی آتا ہے ۔)

زبیدہ ۔ (چونک کر) کون ؟ —— اوہ —— رشید ۔
رشید ۔ ہاں —— زبیدہ —— تم نے منع کیا تھا مگر —— مگر ——
زبیدہ ۔ ہاں رشید میں سمجھتی ہوں ۔ تم (خاموش)
رشید ۔ زبیدہ میری زندگی تباہ ہو جائیگی —— تم جانتی ہو میں تمہارے بغیر نہیں

جی سکتا۔

زبیدہ - مگر رشید ـــــــ ابا جان ـــــــ آہ ابا جان کو ہمارے احساسات کی کیا پرواہ - اُن کی بلا سے - میں ہنس کر زندگی گذاروں یا رو کر ـــــــ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ بس اُن کی بیٹی سونے چاندی میں لدی رہے اور اس کے دروازے پر ہاتھی جھولیں - یہ نہیں سوچتے یہ بیرحم بزرگ - یہ طاقتور لوگ کہ زندگی کے لئے نہ سونے چاندی کی ضرورت ہے اور نہ ہاتھیوں کی۔

رشید - جب تم یہ سوچتی ہو - تو پھر ـــــــ زبیدہ ـــــــ

زبیدہ - رشید میرے سوچنے اور نہ سوچنے سے کیا ہوتا ہے - میں ابّا جان کو دکھ نہیں پہنچا سکتی - مجھ میں انہیں دکھی دیکھنے کی ہمت نہیں - رشید میرا خیال دل سے نکال دو۔

رشید - یہ کیسے ہو سکتا ہے زبیدہ - میں ہزار چاہوں تب بھی تمہارے خیال کو دل سے نہیں نکال سکتا یہ کبھی نہ ہو گا مجھ سے۔

زبیدہ - رشید! مگر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔

رشید " تم ـــــــ تم میرے ساتھ چلو - ہم شادی کر لیں "

زبیدہ - (خوف زدہ ہو کر) " کیا - تمہارے ساتھ بھاگ چلوں اور دُنیا ـــــــ "

رشید " میرا مطلب ـــــــ میرا مطلب یہ نہیں ـــــــ او زبیدہ ذرا سوچو میں تمہارے بغیر ـــــــ اوہ ـــــــ (پژمردہ ہو جاتا ہے)

زبیدہ " مگر یہ تم نے کیسے سمجھا کہ میں تمہارے ساتھ بھاگ نکلوں گی ؟ رشید تمہیں میرے متعلق ایسا خیال کیسے آیا ؟ میرے متعلق ؟ ـــــــ "

رشید " معاف کرو زبیدہ معاف کر دو - میرا ہرگز یہ مطلب نہیں "

زبیدہ " تم جانتے ہو ابّا جان کا کیا حال ہو گا - دُنیا اُنہیں کیسے جینے دیگی - کیا کہیں گے

لوگ۔ سرہدایت علی کی لڑکی بھاگ گئی؟ اوہ رشید ——— سوچو تم
کیا کہہ رہے ہو۔ تم رشید؟
رشید۔ مگر زبیدہ میری طرف دیکھو۔ میرے دل کیطرف دیکھو۔
زبیدہ۔ رشید میں جانتی ہوں۔ سب کچھ جانتی ہوں ——— بس میری بات
مانو مجھے بھول جاؤ۔ خدا تمہیں دنیا میں خوشیاں دکھائے۔ تمہاری مسرتوں
کو دیکھ کر میں بھی خوش ہولوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ (رقت)
رشید۔" اوہ زبیدہ ———"
زبیدہ۔" تم رو رہے ہو رشید۔ میرے دکھے ہوئے دل کو اور دکھا رہے ہو؟۔ مگر
خیر تمہیں کیا۔ جب میرے ماں باپ ہی میری خوشی اور ناخوشی کو نہیں سمجھتے
تو پھر تم ———"
رشید۔" زبیدہ تم جو کچھ کہو میں تیار ہوں۔"
زبیدہ۔" مجھے بھول جاؤ ——— سنا تم نے ———"
رشید۔ یہ نہیں ہو سکتا ——— (جوش سے) زبیدہ میں تمہیں نہیں بھول سکتا
——— میں ——— میں ——— تم میرے دلمیں اسی طرح روشن ستارے
کی مانند چمکا کرو گی۔ میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتا۔ زبیدہ ——— کیا میرے
لیئے کوئی راستہ نہیں؟۔
زبیدہ۔ ذرا سوچو ابا جان کی پوزیشن۔ وہ اس سال الیکشن کیلئے کھڑے ہو رہے
ہیں۔ رشید! ہمارے اور تمہارے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔ بھول
جاؤ مجھے۔
رشید۔ یہ نہیں ہونے کا ——— یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میری زندگی تمہارے
بغیر بیکار ہے۔ میں ———

زبیدہ "رشید! ـــــ کوئی ایسی ویسی بات نہ کرلینا ـــــ دیکھو۔ میری خاطر۔ تمہاری ہر بات میرے لئے زہر قاتل ہو جائیگی۔ لوگ کیا کہیں گے۔ ساری دنیا میں یہ بات اڑ جائیگی کہ سر ہدایت علی کی لڑکی کی خاطر رشید نے جان دی ـــــ ابا جان کیا کہیں گے۔ دُنیا کیا کہے گی۔ تمہیں جینا ہوگا ـــــ"

رشید۔ کیا یہ حکم ہے ـــــ زبیدہ۔

زبیدہ۔ نہیں ـــــ التجا!۔

رشید "اچھا ـــــ اچھا زبیدہ! میں زندہ رہوں گا۔ اس منحوس زندگی کو کسی نہ کسی طرح گذاروں گا۔ اور تم ایک دیوی کی طرح میرے دل میں بسی رہو گی۔ زبیدہ مجھے اس خاموش پرستش کی تو اجازت دو۔ بس ـــــ اوہ ـــــ

زبیدہ " رشید ـــــ تم بھی میرے دل میں ایک مقدّس یاد بنکر رہو گے۔ جاؤ رشید۔ اب جاؤ۔ خدا تمہیں سُکھ دے"

(رشید جاتا ہے۔ دو چار آہوں اور سسکیوں کے بعد رشید بھاری قدموں سے چلا جاتا ہے۔ راستہ میں ایک آدمی کی غمگین راگنی سے خود بخود متاثر ہو کر بڑبڑاتا ہے۔)

رشید "یہ دُنیا ـــــ یہ ناپاک سوسائٹی ـــــ اوہ۔ (محمود سے ٹکر ہو جاتی ہے)

محمود "میرے یار دیکھکر نہیں چلتے۔ کیا بات ہے"

رشید "کچھ نہیں محمود"

محمود "کچھ تو ـــــ بسور کیوں رہے ـــــ اماں نے مارا؟"

رشید "خدا کے لئے مذاق کے لئے موقع اور محل تو دیکھا کرو۔ کہ بس ـــــ"

محمود "اوہو ہو ـــــ یار بھول ہوئی ـــــ اچھا لیلےٰ کے کوچہ سے طواف کرکے آرہے ہو۔ کہو کیا حال ہیں؟"

رشید" جاؤ محمود اپنا راستہ لو۔ مجھے کیوں چھیڑتے ہو؟"
محمود" کچھ بولو بھی ہوا کیا —— کیا بات ہوئی —— سُنا ہے وہ بڈھا بڑا اکڑ رہا ہے —— میں تو پہلے ہی کہتا ہوں کہ چھوکری کو لے کر چلدو۔ پھر ہوتا رہے گا کچھ ——
رشید" تم نے زبیدہ کو نہیں پہچانا۔ وہ جان دیدے گی۔ مگر ——"
محمود" مگر کیا"
رشید" وہ میرے ساتھ کسی طرح بھاگنے پر راضی نہ ہوگی"
محمود" یار میرے بھاگنے کو کون کہتا ہے۔ مزے سے۔ سہج سہج چلدو —— ٹیکسی لو اور اُڑ جاؤ"
رشید" پھر تمہاری بدمذاقی ہوئی شروع —— اور خاندان کی ناک ——"
محمود" چولھے میں ڈالو ناک اور کان —— ناک نہوئی روئی کا پھویا ہو گئی کہ بات بات پر اڑی جاتی ہے اور سچ کہتا ہوں بڈھے ناک سے لمبی تو وٹی بھر میں نہ ملے گی۔ لڑائی کی گڑبڑ میں دُنیا بھاگ رہی ہے۔ تم بھی چلدو۔
رشید" للہ بس کرو۔ کچھ دل کو تسلی دینے سے تو رہے۔ اُلٹی نمک پاشی کر رہے ہو"
محمود۔ تو پھر خودکشی کر لو —— اور کیا۔
رشید" اور زبیدہ کو بدنام کر دوں —— ؟ خوب ؟"
محمود" خوب رہی۔ شادی کرو گے نہیں اور خودکشی —— وہ کرنے نہیں دیتیں"
رشید" بھئی محمود! اب جاؤ نا تم۔ کیوں سر کھپا رہے ہو اپنا"
محمود" اچھا بھائی غصہ کیوں ہوتے ہو —— لو بھئی کچھ نہیں کہتے۔ بس۔ تم۔ رشید پروا نہ کرو۔ یار تمہارے لئے وہ بانکی چھوکری لائیں کہ زبیدہ بھی اُسکے سامنے پانی بھرنے لگے۔ کیوں۔ لو ملاؤ اسی بات پر ہاتھ"

رشید "میں عمر بھر شادی نہیں کروں گا"

محمود "یا اللہ۔ ارے بھائی — تو — تو — سدا کنوارے رہوگے؟"

رشید "محمود! واللہ انسان نہیں پتھر ہو تم — اگر تمہارے اوپر ایسا وقت پڑتا تو میں کبھی بھی تمہارا مذاق نہ اڑاتا"

محمود "مذاق کون گدھا اُڑا رہا ہے۔ اوّل تو ہم بیچارے اتنے خوش نصیب کہاں کہ ہمارے محبوب ہمارے جوتیاں ماریں — اور ہم ارے رے — تم تو آج بات بات پر بھنّائے جاتے ہو۔ ایک بات تو سنو"

رشید "کیا؟"

محمود "تم کہو تو میں زبیدہ کے پاس جاؤں اور اس سے کہوں"

رشید "بیکار ہے۔ سب بیکار ہے۔ وہ مجبور ہے"

محمود۔ مجبور وجبور کچھ نہیں — بنتی ہے کمبخت"

رشید "محمود!"

محمود "ارے۔ یار! تم تو بس آج زبان کترنے پر تلے ہو۔ ذرا کیا سمجھا ہے تم نے مجھے۔ تمہارے ہی بھلے کو کہتا ہوں کہ اس کے پاس جاؤں۔ اور —"

رشید "اور — کیا — ؟"

محمود "اور کہوں کہ تمہیں اپنی غلامی میں لے لے۔ ہاں اور کیا کہوں یہی — کہ تم بھی نرے اُلّو ہو"

رشید "تم چاہو تو جا کر آزما لو۔ مگر میں کہہ چکا ہوں کہ وہ غریب بھی مجبور ہے"

محمود "تم دیکھتے رہو۔ وہ جا کر اُلّو پھیرا ہو کہ بس۔ نہ تمہارے ساتھ بھگوا دوں تو محمود نام نہیں بھنگی۔ کیا سمجھے!"

رشید "یہ بھاگنا بھاگنا کیا لگا رکھا ہے۔ وہ بھی کیا کوئی آوارہ لڑکی ہے کہ تم کہو گے

اور وہ بھاگ کھڑی ہوگی۔"
محمود "کہاں ملے گی وہ اسوقت ؟"
رشید "پارک میں - روز شام کو وہیں جاتی ہے۔"
محمود " اچھا تو میں کوشش کرتا ہوں ——"

**وقفہ**

{ پارک میں آدمیوں کی چہل پہل اور بینڈ کی آوازیں۔ زبیدہ ملتی ہے۔ }

محمود " اوہ —— مس زبیدہ —— ذرا —— آداب عرض —— میں —— آپ مجھے پہچانتی نہیں شاید —— میں نے آپ کو ——"
زبیدہ " جی میں نے آپ کو کالج کے جلسہ میں کئی بار دیکھا ہے۔"
محمود " میں رشید کا دوست ہوں - یہاں بینڈ بہت زور سے بج رہا ہے آپکو تکلیف نہ ہو تو ذرا اس طرف چلیں۔
زبیدہ (چل کر) "کہیے کچھ کہنا ہے آپ کو ——"
محمود " جی —— وہ —— میں رشید کا دوست ہوں۔ یہ کہنا تھا آپ سے کہ وہ جو آپکے والد صاحب نے کیا وہ تو ذرا سخت سا معلوم ہوتا ہے۔"
زبیدہ " ہوں۔"
محمود " آپ جانتی ہیں - رشید ایک بودا سا انسان ہے بیچارہ ہمیشہ کا جذباتی، دکھی، اور پریشان۔"
زبیدہ " جی۔"
محمود " وہ جب سے اوندھا پڑا ہے بیچارہ۔"
زبیدہ " پھر میں کیا کر سکتی ہوں۔"

محمود "آپ بہت کچھ کر سکتی ہیں یعنی سب کچھ آپ ہی کر سکتی ہیں۔ کیوں اسکی زندگی بگاڑتی ہیں"

زبیدہ "لیکن آپ کو اس سے مطلب ؟"

محمود "مطلب ——— لیجئے بہت کچھ۔ وہ میرا بچپن کا دوست ہے۔ دوسرے۔

زبیدہ "ہاں دوسرے ———"

محمود "دوسرے یہ کہ ——— وہ ——— وہ آپ تو جانتی ہی ہیں عشق میں انسان کیا سے کیا ہو جاتا ہے"

زبیدہ "مسٹر محمود!"

محمود "جی جی۔ معاف کیجئے گا ——— کیا ؟"

زبیدہ "آپکا طرز گفتگو ——— معاف کیجئے گا نہایت عامیانہ ہے"

محمود "اوہ۔ جی ہاں۔ مگر میرے طرز گفتگو پر نہ جائیے۔ میرے جذبات پر غور کیجئے۔ ذرا سوچئے وہ میرے کمرے میں رہتا ہے۔ ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہے۔ نیند میں بھڑاتا ہے۔ لازمی طور پر مجھے بھی اُس ——— کے ساتھ پریشان ہونا پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہاں تک درست ہے کہ ———"

زبیدہ "کیا مطلب آپکا ———"

محمود "یہ کہ پہلے تو اُسے پھانس لیا آپنے اور پھر ———"

زبیدہ "مسٹر محمود (چلنے لگتی ہے) میں آپکی بکواس سننے نہیں آ[illegible]"

محمود "ارے تو میں نے کہا ہی کیا ——— ارے سنئے تو سہی [illegible] دو باتیں"

زبیدہ "بس۔ بس میرے ساتھ نہ آیئے۔ لوگ آپکو میرے [illegible] ساتھ دیکھ کر کیا کہیں گے"

محمود "کیا کہیں گے۔ لاحول ولا قوۃ۔ کوئی میں آ[illegible] سے عشق لڑا رہا ہوں۔ واہ جی واہ!"

زبیدہ" آپ بڑے بیہودہ ہیں"

محمود" جی بجا - ہوں گا بیہودہ مگر میرا مطلب ہے آپ ذرا اطمینان سے میری بات سن لیجئے - نہ جانے لوگ میری باتوں سے کیوں بگڑنے لگتے ہیں - آپکے رشید ——"

زبیدہ" محمود صاحب —— تشریف لے جائیے - آپکی زبان قابو میں نہیں ہے"

محمود" ارے توبہ! اچھا صاحب سنیئے - اگر آپ اُس سے شادی نہ کریں گی - تو مرجائیگا کمبخت - افیونی ہے منحوس کہیں کا"

زبیدہ" میں مجبور ہوں —— میرے والد صاحب ......"

محمود" ارے چھوڑیئے صاحب - اب آپ جوان ہیں - آپ سمجھدار ہیں - اپنی اونچ نیچ خود دیکھ سکتی ہیں"

زبیدہ" مگر اُن کی پوزیشن ؟ -

محمود" اُن کی پوزیشن بہت اونچی —— مگر صاحب رشید میں بُرائی ہی کیا ہے - بس غریب ہی تو ہے"

زبیدہ" غریب امیر کا سوال نہیں - سوال اس کا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے - اگر [illegible] رشید سے شادی کرلوں تو لوگ یہ نہیں کہیں گے کہ سر ہدایت علی کی لڑکی آوارہ ہوگئی ایک کنگال کے ساتھ چلدی"

محمود" اس میں آوارگی کیا ہے - جوانی میں سب ہی کرتے ہیں - آپکے والد صاحب معاف کیجئے گا جوانی میں کیا کم آوارہ ہونگے"

زبیدہ" خاموش رہیے - بدتمیز - جاؤ یہاں سے - ورنہ ——"

محمود" یا وحشت - معاف کیجئے گا - میری زبان کمبخت گندی ہے - سنیئے تو - بس ایک بات ——"

زبیدہ "آپ بیکار خود کو تھکا رہے ہیں"
محمود "تو چلئے اس بنچ پر بیٹھ جائیں ـــــ ذرا کے ذرا ـــــ"
زبیدہ "آپ چلے جایئے ورنہ میں سپاہی کو بلواتی ہوں"
محمود "اوہ ـ خیر ـ ایک دفعہ ذرا پھر سوچ لیتیں"
زبیدہ "سوچ لیا میں نے ـ آپ تشریف لیجائیے"
محمود "لے جا تو رہا ہوں تشریف ـ ایک بات سنئے ـ وہ"
زبیدہ "کیا"
محمود "کہ اگر رشید کی جگہ میں ہوتا تو ـــــ تو....."
زبیدہ "تو ـ ہنہ تو کیا کرتے آپ"
محمود "میں ؟ ـ بس کیا بتاؤں ـ دھری رہ جاتیں آپکی ساری باتیں اور میں
ـــــ (چٹکی بجاتا ہے) بس"
زبیدہ ـ (ہنس دیتی ہے) ـ
محمود "اوہو! شکریہ ـــــ شکریہ!"
زبیدہ "کیسا شکریہ ؟"
محمود "آپ کے تبسم فرمانے کا ـ شکریہ ہے کہ اب آپ غصہ نہیں ـ اب تو آپ اس غریب کا دکھڑا سُن لیں گی"
زبیدہ "میں ایک دفعہ آپ سے کہہ چکی کہ میں مجبور ہوں ـ میں اپنے والد کا حکم نہیں ٹال سکتی"
محمود "لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آپکے والد صاحب ایسا چنگیزی حکم کیوں نازل کر رہے ہیں ـ ویسے تو بڑے قوم پرست بنتے ہیں ـ جب اپنی لڑکی کا سوال آتا ہے تو غریب کو ٹھکرا کر موٹے سے سیٹھ کی تاک میں ہیں ـ میں سچ کہتا

ہوں - لالچی بڈھا ــــــ"

زبیدہ" کون لالچی بڈھا ــــــ"

محمود" معاف کیجئے گا- آپکے والد صاحب قبلہ ــــــ زبان کمبخت"!-

زبیدہ" محمود صاحب! میں پھر آپ سے کہتی ہوں براہ کرم یہاں سے دفعان ہو جائیے اور ــــــ"

محمود" سنئے تو ــــــ"

زبیدہ" میں کچھ نہیں سننا چاہتی ــــــ" (چلدیتی ہے)

محمود" بس ایک بات ــــــ اونہہ ــــــ" (سیٹی بجاتا چلدیتا ہے)

وقفہ

محمود- (واپس آکر رشید سے) "لو بھئی ہم تو اپنی سی کر آئے"

رشید- (ذرا تیزی سے) "میں نہ کہتا تھا- وہ کبھی بھی اپنے خاندان کی ناک نہ کٹوائیگی"

محمود" خاندان کی ناک ــــــ سب مکّاری ہے- اِن خاندانوں کی ناک ٹکے سیر بکتی ہے - یہ لڑکیاں خود جو کچھ نہیں کرنا چاہتیں خاندان اور سماج کے سر تھوپ دیتی ہیں اُس کا سارا الزام - اور خود مظلوم بن جاتی ہیں"

رشید" خیر اب تو تمہیں معلوم ہوگیا کہ زبیدہ اُن لڑکیوں میں سے نہیں"

محمود" قطعی نہیں ــــــ وہ بالکل بہانے کرتی ہے - تم تو ہو بزدل"

رشید" اسمیں بزدلی کیا ہے؟ - کر کیا سکتا ہوں میں؟"

محمود" یہ کر سکتے ہو جی ــــــ کہ ناک کاٹ لو چڑیل کی"

رشید" محمود!"

محمود" بکواس نہ کرو - ہتک کرتے ہو تم مردوں کی - مردانگی کی اور مردوں کی طاقت کی - تمہاری بیگمات ہوتا تو ــــــ"

رشید "کیا کرتے ؟"

محمود "وہ کرتا کہ زبیدہ بیگم کی سات پشتیں یاد کرتیں ۔سنو رشید تم تو اُسے اب دیوی سمجھتے ہو نا ۔کیوں ؟"

رشید "قطعی ۔ اور کیا رہ گیا ہے میرے لئے دنیا میں "

محمود "قطعی ! تو پھر چلو ہٹاؤ۔ بس تم اُسے پوجا کرو اور ہم اُس سے شادی کرتے ہیں"

رشید "معلوم ہے تمہیں کہ تم مجھ سے کچھ زیادہ امیر نہیں "

محمود "امیر غریب کیا ۔ میں تم سے کنگال ہوں ۔ تمہارے چچا بیس روپیہ مہینہ دیتے ہیں اور میں کالج کے خیرات خانے میں پلا ہوں ۔ تو بس فیصلہ ہو گیا ۔ سنو اِس ہفتہ کے اندر اندر یہ ہم شادی کر کے دکھا دینگے ۔سُنا "

رشید ۔ (زور سے قہقہہ لگاتا ہے) "ضرور "

محمود "کیا گدھے کی طرح منہ پھاڑ رہے ہو ـــــ لو ـــــ شرط بدلو "

رشید ۔ (مذاق میں) "خوب ! بھئی ـــــ واہ اچھی شرط ہے "

محمود "ہاں ہاں ۔ لو ۔ اِس ہفتہ کے اندر لو ۔ تم تو دیوی بنا کر پوجتے رہو ۔ اور ہم لاتے ہیں اُسے ۔ رشید جانتے نہیں ہو مجھے ۔ اگر کالج کے جھگڑے میں نہ پڑتا تو آج کو ـــــ "

رشید "آج کو ہٹلر ہوتے ہندوستان کے "

محمود "کچھ بھی ۔ یہ ہتک ہے ہماری سمجھے ۔ اب تم دیکھنا ۔ کیا بتائیں ۔ یار آج تو اِلہ آباد جانا ہے ۔ اسٹوڈنٹس ایسوسیشن کی میٹنگ ہے "

رشید "تو پھر چھوڑ دو اس میٹنگ کو "

محمود "نہیں جی کرایہ مل گیا ہے سکنڈ کلاس کا ۔ جانا تو پڑے گا "

رشید "اور پھر شادی ؟ "

محمود" شادی بھی ہوگی۔ تم ذرا اچکن وغیرہ دُھلوالو ورنہ بالا تو تم کو ہی بننا پڑے گا۔" (دونوں قہقہہ لگاتے ہیں)

## اسٹیشن

(اسٹیشن پر خوانچہ والوں کی پکار۔ ریل کی گڑبڑ۔ دھکا پیل۔ زبیدہ نظر آتی ہے۔)

محمود" اوہو ـــــ مس زبیدہ آپ بھی تشریف لے جارہی ہیں"

زبیدہ" جی میں کلکتہ جارہی ہوں خالہ کے پاس اپنی"

محمود" ہوں۔ رشید سے ڈرکر؟"

(اخبار والے کی آواز)

زبیدہ" اخبار ـــــ اے اخبار والے"

محمود" ٹھیک ۔ میں بھی الہ آباد جارہا ہوں۔ آپکو اگر کوئی تکلیف ہو تو ـــــ"

زبیدہ۔ (رکھائی سے) شکریہ۔ اخبار والے"

(ریل چل دیتی ہے۔ دوسرے اسٹیشن پر وہ پھر اخبار والے کو پکارتی ہے۔ وہ نہیں سنتا تو نیچے اُتر کر بک سٹال پر جاتی ہے۔ ریل چلدیتی ہے اور وہ جلدی میں محمود کے ڈبے میں گھس جاتی ہے۔)

محمود" ارے ـــــ کون ہے جی ـــــ"

زبیدہ" میں ہوں۔ ریل چلدی اور جلدی میں ـــــ"

محمود" اچھی جلدی ہے ـ اوہ ـــــ آپ ہیں مس زبیدہ۔ معاف کیجئے گا میں سمجھا کوئی آوارہ عورت ہے۔ تاکہ ـــــ"

زبیدہ۔" کیا؟"
محمود۔" تاکہ موقع ملے اور مجھے پھنسا دے۔ اجی میں اِن عورتوں سے بہت ڈرتا ہوں۔ اور خاص طور پر اکیلے ریل کے ڈبوں میں۔"
زبیدہ۔" آپ عورتوں سے بھی ڈرتے ہیں؟"
محمود۔" جی۔ صرف عورتوں سے ہی ڈرتا ہوں۔ مردوں کو تو ٹھوک کر درست کر لیتا ہوں۔ مگر۔۔۔"
زبیدہ۔" آپ مجھ سے بھی ڈرتے ہیں۔۔۔" (اطمینان سے)
محمود۔" کہہ تو دیا۔ سب عورتوں سے ڈرتا ہوں۔"
زبیدہ۔" مگر میں بھلا آپ کا کیا بگاڑ سکتی ہوں۔"
محمود۔" بگاڑ تو آپ بھی خوب سکتی ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھئے گا کہ میں آپ کو بگاڑنے دوں گا۔۔۔"
زبیدہ۔" یہ کیسے؟"
محمود۔" یہ ایسے کہ ابھی آپ غل مچا دیں کہ میں آپ کی عزت لے رہا ہوں۔ تو۔۔۔"
زبیدہ۔" محمود صاحب!"
محمود۔" جی مجھے گھُرکیاں دینے کی کوشش نہ کیجئے۔ یہ پارک کا میدان تو ہے نہیں۔ نہ بابا جی کا گھر۔ یہ میرا ڈبہ ہے۔ سمجھیں۔"
زبیدہ۔" آپ بالکل وحشی ہیں۔ بات کرنے کی تمیز نہیں۔"
محمود۔" جی میں وحشی سہی۔ بڑی آئیں وہاں سے تمیز سکھانے۔ اگر میں ابھی ابھی اُٹھ کر آپکو اپنا گرم گرم بھونا دیتا اور خود بیٹھ کر آپکی حسین صورت تکتا تو آپکے ہاں میں بہت تمیز دار ہوں۔ معاف کیجئے گا ایسے اُلّو کہیں اور بستے ہیں۔"
زبیدہ۔" آپ یا تو پاگل ہیں۔۔۔ یا۔۔۔"

محمود "پاگل ہوئی آپ ——— اگر آپ زبان سنبھال کر نہیں بیٹھ سکتیں تو تشریف لے جائیے"

زبیدہ "یہ آپ کا ڈبہ تو نہیں"

محمود "جی ہاں۔ اسوقت تو یہ ڈبہ میرا اور میرے باپ کا ہے۔ سُنا۔ اگر آپ چیں چیڑ کریں گی۔ تو کان پکڑ کر ———"

زبیدہ "میں ——— زنجیر کھینچ لوں گی۔ اگر آپ ———"

محمود "ذرا کھینچیے تو زنجیر۔ اُٹھا کر ریل سے باہر پھینک دوں گا۔ رشید نہ باشد کہ اُلّو بنا لیا"

زبیدہ "آپ کو شرم نہیں آتی ——— عورتوں ———"

محمود "ہم کچھ عورتیں ورتیں نہیں جانتے۔ سمجھیں۔ اور ہمیں کچھ شرم نہیں آئے گی۔ کون یہاں بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ اُٹھا کر پھینک دینگے۔ اور پھر کہہ دینگے۔ جان کر کود پڑی۔ خودکشی کرنا چاہتی تھی"

زبیدہ۔ "آپ جھوٹ بھی بول سکتے ہیں۔ کون ماننے گا آپ کی بات؟"

محمود "ہاں ہاں کیوں نہیں ——— سب مان لیں گے۔ جب میں اُنہیں بتاؤں گا کہ والد آپکے عاشق سے شادی نہیں کرنے دیتے تھے۔ اسلیے"

زبیدہ "عجیب انسان ہیں آپ"

محمود "اور دو میرے۔ تم ——— تم ———"

زبیدہ "کیا؟"

محمود "یہی کہ تمہیں اکیلے سفر کرتے ڈر نہیں لگتا؟"

زبیدہ "کیوں اس میں ڈر کی کیا بات ہے"

محمود "تو کوئی ڈر کی بات نہیں۔ فرض کیجیے کوئی آپکی عزت پر حملہ کرے"

زبیدہ "ایں - ایں ——— واہ ———"
محمود "ہاں ——— فرض کیجئے میں ہی ——— میں ہی ذرا ———"
زبیدہ "مجھ سے بات نہ کیجئے ——— آپ پاگل ———" (مڑ جاتی ہے)
محمود "اے جی دیکھو ہم کسی کی بدزبانی نہیں سہ سکتے - زبان کاٹ لیا کرتے ہیں -
اور سنو - ادھر منہ کرکے بیٹھو - ہمارا دل گھبراتا ہے - دوسرے پیٹھ کرکے
بیٹھنا بدتمیزی ہے "
زبیدہ "مگر ——— مگر آپ ایسا مذاق ———"
محمود "مگر اور مچھلی ہم نہیں جانتے - اور نہ ہم تم سے مذاق کر رہے ہیں "
زبیدہ "میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے - جو آپ ———"
محمود "تم نے میرا بہت کچھ بگاڑا ہے - تم نے میری ذلت کی - رشید کی ذلت
میری ذلت ہے - بلکہ سارے نوجوانوں کی ذلت ہے "
زبیدہ "اسٹیشن آ رہا ہے میں اتر جاؤں گی "
محمود "نہیں - نہیں اتر سکو گی تم "
زبیدہ "آپ مجھے زبردستی روکیں گے کیا ؟"
محمود "اور کیا ؟ - دیکھئے گا "
زبیدہ - (ذرا اترنے کی کوشش کرکے) آپ روک کیسے سکتے ہیں - ہستی آپ کی ———"
محمود "ہستی تو میری بڑی بھاری ہے - پکڑ لوں گا - یوں " ——— (اسکا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)
زبیدہ "چھوڑئے ——— چھوڑئیے مجھے ——— چھوڑ ———"
محمود "اچھا - اچھا ——— لو - مگر دیکھو اترنے کی کوشش نہ کرنا - ورنہ ٹھیک نہ ہوگا -
سمجھیں - سب کے سامنے پکڑ کر - ہاں لوگ پوچھیں گے تو کہہ دوں گا میری بیوی ہے "
زبیدہ "محمود صاحب ! "

محمود "بیوی ہے اور روٹھ گئی ہے۔ ذرا —— (ہنستا ہے) جناب کیا سمجھیں۔
اب تم اسٹیشن پر انہیں کہاں ثبوت دیتی پھرو گی کہ میری بیوی نہیں۔
سر ہدایت علی کی بیٹی ہو۔ ہاں اور سارے اخباروں میں چھپ جائیگا۔
لوگ کیا کہیں گے۔ اور پھر وہ الیکشن —— وہ اسمبلی میں سیٹ سب
خالی رہجائیگی —— اور بھئی میں تو ایک کنگال طالب علم ہوں۔ کہدونگا
بیوی نہیں معشوقہ سہی۔ میرے ساتھ بھاگ کر جا رہی ہے بیچاری۔ ارے آپکو
سردی لگ رہی ہے۔ یہ لیجئے کمبل !۔

زبیدہ "ہٹ جائیے ہوچکا مذاق "

محمود "کون کمبخت مذاق کر رہا ہے۔ لو۔ ہماری قسم کمبل اوڑھ لو"

زبیدہ "جھوٹے۔ مکّار۔ زمانہ بھر کے "

محمود "اور ——" (ہنستا ہے)

زبیدہ "بدمعاش —— "

محمود "اہا ہا۔ کیا پھول جھڑ رہے ہیں مُنہ سے۔ اور کہئے۔ اور کچھ فرمائیے۔ دیکھئے
ریل رُک رہی ہے۔ کہیئے تو آپ کو غسل خانہ میں بند کردوں۔ اور۔ ہاں
یہ ٹھیک رہے گا۔ ورنہ آپ ——"

زبیدہ "آپ حیوان ہیں بالکل "

محمود "ہاں ضرور ہونگا۔ لو بابا کمبل تو اوڑھ لو۔ سردی لگ گئی تو کہاں علاج
کراتا پھروں گا غریب آدمی "

زبیدہ "ہٹ جاؤ۔ مردود کہیں کے "

محمود "اوہو۔ اَب بھی اکڑ باقی ہے۔ دیکھو جی میں مذاق نہیں کرتا۔ پھر کہتا ہوں
کمبل اوڑھ لو۔ ورنہ ——" (قہقہہ)

زبیدہ" آپ کو کیا ملے گا مجھے پریشان کر کے "
محمود" تمہیں پریشان کر کے؟ ــــــ تم سمجھتی ہو میں تمہیں پریشان کر رہا ہوں!
سنو میں موقع کی تاک میں ہی تھا۔ اور بھئی کمال ہے کہ موقع خود شاید
میری تاک میں تھا۔ واہ رے اللہ میاں - واہ"
زبیدہ" کیا بک رہے ہیں آپ؟"
محمود" میں یہ بک رہا ہوں کہ میں جناب سے شادی کر رہا ہوں۔ کرنیوالا ہوں"
زبیدہ" کیا واہیات ہے"
محمود۔ مذاق نہیں جب تم رشید سے شادی نہیں کرتیں۔ تو میں ــــ میں موجود ہوں۔
زبیدہ" خاموش۔ بیہودہ"
محمود۔ دیکھو کئی دفعہ کہہ چکا ہوں بدزبانی نہ کرو۔ ہاتھ اٹھ جائے گا تو پھر۔
ہاں دیکھو میں نے اُسوقت ارادہ کر لیا تھا کہ تم سے شادی کروں گا"
زبیدہ" زبردستی ــــ"
محمود" قطعی اگر اس کی شاید ضرورت نہ پڑیگی"
زبیدہ" مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے" (ہنستی ہے)
محمود" یہ ایسے ہوگا کہ کل اخباروں میں چھپ جائیگا کہ سر ہدایت علی کی صاحبزادی
صاحبہ کی شادی خانہ آبادی مسٹر محمود متعلم ایم۔ ایس۔ سی سے انجام پا گئی۔
آپ کو معلوم نہیں۔ میں آج ہی پریس کو لکھوں گا اور کل سارے اخباروں
میں آپ کے والد صاحب پڑھیں گے"
زبیدہ" آپ شاید بھول رہے ہیں کہ ــــ"
محمود" کہ مقدمہ چل جائیگا۔ تو کیا ہوگا۔ وہ پیسہ کا آدمی ہوں۔ قید، سزا جو ہوگی
بھگت لوں گا۔ مگر آپ اپنی کہئے۔ وہ آپ کے والد کا نام اُچھلے گا ــــ

اور میرا کیا ہے میرا کیا کوئی بگاڑے گا۔ دو کوڑی کا آدمی ـــــــ" (قہقہہ)

زبیدہ" مگر یہ آپ میری زندگی کیوں برباد کرنا چاہتے ہیں؟"

محمود" میری مرضی"

زبیدہ" یہ اچھی ضد رہی آپکی!"۔

محمود" ہاں میری ضد ہی جو ہوئی۔ دوسرے صرف ضد کا سوال نہیں۔ میں نے شیدے کو بڑہانکی ہے کہ تم سے ایک ہفتہ کے اندر شادی کر کے دکھا دوں گا۔ تیسرے ـــ"

زبیدہ" کیا تیسرے؟"

محمود" تیسرے یہ ـــــ کہ ـــــ زبیدہ مجھے تم کچھ پسند بھی آنے لگی ہو اور جو چیز مجھے پسند آتی ہے میں اُسے ضرور حاصل کرتا ہوں"

زبیدہ" مگر آپ سمجھتے ہیں اِس زبردستی کی شادی سے آپ خوش رہ سکیں گے؟"

محمود" اوہ ــــ بہت خوش ــــ چور چوری کر کے مزے سے چیز استعمال میں لاتا ہے۔ اور وہ مسرت ہوتی ہے کہ کہنا نہیں۔ سنا نہیں تم نے چوری کا گڑ میٹھا ـــــ لو اسٹیشن آرہا ہے۔ دیکھو اگر اپنے والد کا نام بدنام کرنا نہیں چاہتیں تو چپکے سے کمبل اوڑھ لو۔ اور ذرا آرام کر لو۔ یہ تو طے ہو گیا کہ تم میرے ساتھ الہ آباد جا رہی ہو۔ وہاں سے میں تمہارے والد کو تار اور خط بھیجدوں گا اور کل اخبار میں ــــــ"

زبیدہ" یہ نہیں ہو سکتا۔ میں قطعی آپکے ساتھ نہیں جاؤں گی"

محمود" کیوں اپنا کھیل بنواتی ہو۔ سٹیشن پر ہاتھ پکڑ کر گھسیٹوں گا۔ خدا کی قسم تصویریں چھپ جائیں گی اور پھر جانتی ہو اپنے والد کو ــــــ"

زبیدہ" خدا کے لئے ﷲ ذرا سوچئے۔ یہ آپ کو ہوا کیا ہے"

محمود" خاندان کی ناک کٹ جائیگی زبیدہ بی۔ اور میرا کچھ نہ بگڑے گا۔ جانتی ہو

بیرسٹر صاحب کو وہ جو تمہارے ابا جان کے خلاف کھڑے ہو رہے ہیں سب وہ میری طرف سے مقدمہ کی مفت پیروی کریں گے۔ اخباروں میں نکلے گا کہ ——— کہ اور پھر تم تو سمجھدار ہو"

زبیدہ "آجکل بھی ایسے موذی ہوتے ہیں ——— خدا"

محمود "موذیوں کی دنیا میں کبھی کمی نہیں ہوتی۔ لو کمبل اوڑھ لو۔ میں بجلی بجھائے دیتا ہوں۔ اسٹیشن آرہا ہے۔ زنجیر کی طرف سے دھیان ہٹا لو۔ میرے ہاتھ کافی مضبوط ہیں ——— ان کی بانگی دیکھنا چاہتی ہو ——— ہی ہی۔ ہڈی پسلی سرمہ ہو جائیگی۔ لو سیدھی بیٹھو آنسوؤں سے میرے اوپر کوئی اثر نہ ہوگا۔ مجھے عورتوں کے آنسو بڑے پیارے لگتے ہیں۔ دیکھو۔ لو احتیاطاً میں تمہارے منہ پر ہاتھ رکھے لیتا ہوں۔ چیخ نہ دو"

زبیدہ "ہٹائیے ہاتھ میں نہیں چیخوں گی"

محمود "ہاں یہ بات ہے۔ اب ہوئیں تم ٹھیک۔ چائے پیو گی ؟"

زبیدہ "نہیں"

محمود "کافی ؟"

زبیدہ "نہیں"

محمود "سوڈا، لیمن، برف ؟"

زبیدہ "نہیں"

محمود "ارے باپ رے ——— پھر کیا پیوگی"

زبیدہ "زہر"

محمود "چھی چھی ——— اچھی لڑکیاں زہر پی کر خاندان کو بدنام نہیں کیا کرتیں۔ لو سگریٹ پی لو ——— نہیں ——— خیر"

{زبیدہ کے والد اور والدہ

جج صاحب "او— آ— یہ— یہ— دیکھتی ہو— زبیدہ کی ماں - اخبار!"
بیگم "کیا - اوئی موا انگریزی اخبار منگاتے ہو - میں کیا جانوں - کیا ہے"
جج صاحب "ہے کیا تمہارا اور میرا سر - زبیدہ - زبیدہ - اوہ"
بیگم "اے کچھ کہو بھی ہوا کیا— ؟"
جج "ریل— الٰہ آباد"
بیگم "کیا ہوا الٰہی خیر - میری بچی - اے میرے مالک - اے کچھ بولو گے بھی - میں اپنا سر پھوڑ لوں گی - اللہ جانتا ہے"
جج "بد نصیب— یا اللہ"
بیگم "کیا - اے کیا ریل لڑ گئی کیا ہوا - ہائے میری بچی - اللہ میرے - یا مولا—"
جج "نابکار لڑکی— مُردار"
بیگم - (رو کر) "اے میرے مالک! ارے کچھ پھوٹو بھی منہ سے"
جج "بھاگ گئی"
بیگم "خاک تمہارے منہ میں— کون؟"
جج "وہی تمہاری صاحبزادی— ایک ایم - اے کے ساتھ"
بیگم "اوئی کچھ ہوش میں ہو— وہ تو کلکتہ گئی ہے اپنی خالہ کے پاس"
جج "خاک گئی ہے خالہ کے پاس - یہ لکھا ہے تمہارے سامنے - یہ کہ بھاگ گئی - اوہ - بڑھاپے میں منہ کو کالک لگا گئی - نابہجار - مرجاتی اس سے تو - اسی دن کو کہتا تھا - خالہ نانیوں کے پاس نہ بھیجو - سب آوارہ ہیں چڑیلیں -
بیگم "آوارہ ہوں گی تمہاری اماں بہنیں - واہ - خوب چلے میرے میکہ والوں کو کہنے"

جج ۔" آگ لگے تمہارے میکہ کو منع کیا کہ نہ بھیجو "

بیگم ۔" آگ لگے تمہارے گنوں کو منع کیا کہ نہ کراؤ ایم ۔ اے ۔ بی ۔ اے ۔ مگر نہیں وہ تو لاڈلی کو ـــــ اور جو منع کرنے کو کہتے ہو تو یہ کب کہا تھا تم نے کہ بھاگ جائیگی ۔ یہ کہا تھا موسم خراب ہے ۔ نمونیہ کا ڈر ہے "

جج ۔" نمونیہ ـــ کاش نمونیہ ہو جاتا ۔ مر جاتی ۔ پیدا ہی نہ ہوتی ۔ اور میں سید صاحب کو زبان دے چکا ہوں "

بیگم ۔" ہائے میری بچی "

جج ۔" تمہاری بچی ۔ تمہیں اپنی بچی کی پڑی ہے اور مجھے اپنی ۔ الیکشن میں ۲۲ دن رہ گئے ہیں ۔ سارے کیئے کرائے پر پانی پھر گیا ۔ یا خدا ۔

نیاز ۔" آسکتا ہوں میں ؟ "

جج ۔" ارے آجاؤ بھیّا ـــ یہ ـــ اوہ ـــ اُفوہ "

نیاز ۔" غضب ہو گیا بھائی صاحب ۔ یہ قصّہ کیا ہے ؟ میں نے تو آج اخبار بھی نہیں دیکھا ۔ آپ کی بھاوج بولیں ۔ لو مبارک ہو "

بیگم ۔" خاک پڑے مبارک باد دینے والوں پر ۔ کسی کا گھر جلے اور کوئی ہولی کھیلے ۔ یہ خوب رہی "

نیاز ۔" معاف کیجئے گا بھابی جان اُنہیں کیا معلوم اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی خبر نہ تھی کہ یوں وہ ناک کٹا جائیگی ۔ مجھے زبیدہ سے یہ اُمید نہ تھی ۔ کیا قصّہ ہے گئی کیسے ؟ "

بیگم ۔" ارے کلکتہ خالہ کے ہاں جانے کی رٹ لگا رہی تھی ۔ مجھے کیا معلوم میں نے ہاں کر دی ۔ اے لو وہ چلدی ۔

نیاز ۔" بھئی معاف کیجئے گا بھابی جان آپکے ـــــ بھئی وہ لوگ ایسے ہی آزاد

خیال ہیں۔ وہ تو ہمیشہ کہا کرتی ہیں۔ آپ کی بھاوج کے ——"

**بیگم:**" جسے دیکھو میرے میکہ ہی کا رونا روتا آتا ہے۔ تمہاری سسرال والیاں کونسی
تجنّیں بنی بیٹھی ہیں۔ خیر النساء نے حمید سے نکاح پڑھوالیا۔ بیٹے برابر لڑکا
کر تمیہ بی ——"

**نیاز:**" معاف کیجئے گا۔ مگر میری سسرال کی لڑکیاں کوئی بھاگی نہیں"

**بیگم:**" اور میرے یہاں دن رات بس لڑکیاں پڑی بھاگتی رہتی ہیں"

**جج:**" ارے بھئی تم لوگ تو لڑنے لگے۔ یہ تو دیکھو۔ یہ تو سارے خاندان کی
ناک کٹ گئی"

**نیاز:**" جی بالکل بجا۔ اب میری پوزیشن بھی کچھ ویسی ہو گئی۔ آخر میرے بھی
بیٹیاں ہیں۔ مہ رو کی منگنی ہو رہی ہے۔ کیا کہیں گے سننے والے"

**جج:**" اوہ۔ جی چاہتا ہے کچھ کھا کر سو رہوں۔ زبیدہ تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔
(روتے ہیں) اللہ پاک اسے جلد اس دنیا سے اٹھالے"

**نیاز:**" مگر بھائی صاحب اب کیا کیا جائے۔ یہ بیرسٹر صاحب تو آپ فتنت برپا
کردینگے۔ ہزاروں پر پانی پھر گیا۔ اور مجھے مہ رو اور گلو کی فکر ہے رتقا بیدلہ
صاحب کا لڑکا ٹریننگ میں تھا"

**بیگم:**" ارے بھائی ——— کیا اپنی پڑی ہے اور یہ کوئی نہیں بتاتا کہ وہ ہے کہاں؟"

**جج:**" ہو گی کہاں تمہیں ہیں۔ الہ آباد میں ہے اس باجی کے ساتھ ٹھہر جاؤ
بچے ناک میں تیر نہ ڈال دیا تو ہدایت نبی نام نہیں۔ کسی کالج میں
پڑھتا ہے"

**نیاز:**" نہیں ——— کالج میں"

**جج:**" تو آج ہی لو ——— ٹھیر تو جاؤ۔ [illegible] زبیدہ کو کوئی [illegible] تو

بات نہیں "

نیاز "گولی مارنے سے کیا ہوگا۔ مجھے تو مہر و گلّو کا خیال ہے۔ ان کی شادی۔ اب کتنی مصیبت آگئی۔ زبیدہ نے میری زندگی ـــــ"

بیگم "اے بھیّا برا نہ ماننا ویسے بھی تمہاری مہر و گلّو پر کون سے پیر ایزاد ٹوٹے پڑتے ہیں"

جج "ابھی اس عورت کی زبان ـــــ نیاز میاں تم ہی چپ رہو"

نیاز "میں بھائی صاحب بالکل چُپ ہوں۔ میری مہر و گلّو کچھ بھی ہوں بھابی جان وہ بھاگ کر نہیں چلی گئیں۔ وہ شریف کی بیٹیاں ہیں "

بیگم "اور میری زبیدہ کمینی کی جنی ہے ؟"

نیاز "کچھ بھی ہو۔ میرا اس میں کوئی دخل نہیں صاحب۔ مگر اتنا تو کہوں گا کہ خاندان کی ناک گئی۔ اور بھائی صاحب الیکشن "

جج "ہاں بھائی الیکشن ـــــ وہ بھی گیا سمجھو ـــــ اوہ مجھے وہ مل جائے مردار

(زبیدہ پریشان داخل ہوتی ہے)

کون ـــــ ؟ زبیدہ آگئی ـــــ خاندان کے نام کو آگ لگا کر چڑیل آگئی تو"

زبیدہ "امی جان !ـــــ"

جج "بس خاموش۔ آوارہ۔ بدمعاش کہیں کی ـــــ نکل دور ہو میری نظروں سے۔ نکل جا یہاں سے مردار۔

زبیدہ "ابّا جان !ـــــ"

جج "خاموش ـــــ بدمعاش لڑکی۔ مجھے باپ کہہ کر ذلیل نہ کر۔ ننگ خاندان۔ نکل جا یہاں سے دور ہو۔ دور ہو۔ (جوش سے اٹھتا ہے)

نیاز "بھائی صاحب ـــــ بھائی صاحب ـــــ قبلہ۔ ذرا ـــــ"

زبیدہ "چچا جان ـــــ میں ـــــ"

نیاز:" زبیدہ! میں تمہارا چچا نہیں ہوں معاف کرو، مجھے مہربانی سے چچا نہ کہو۔ میں اس لائق نہیں"

زبیدہ:" مگر سنئے تو ـــــ"

نیاز:" مجھے کچھ سننے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارے والدین بیٹھے ہیں۔ تم انہیں اپنے جھگڑے سناؤ۔ مجھے تو تم سے صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ تم نے خاندان کیلئے اچھا نہ کیا۔ تمہاری معصوم بہنیں مہرو گلو تمہاری اس حرکت سے ـــــ"

زبیدہ:" میری حرکت! ۔ مگر سنئے تو ـــــ"

جج:" چپ رہ بدمعاش لڑکی۔ غارت ہو یہاں سے۔ نکل جا میرے گھر سے۔ نکل۔ ابھی غارت ہو"

زبیدہ:" نکل جاؤں گی ـــــ ابا ـــــ"

جج:" نکل۔ نکل۔ اور دفان ہو" (زور سے دھکا دیتا ہے۔ زبیدہ گر پڑتی ہے) میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ مجھے بدنام کرکے اب مجھے لیکچر دینے آئی ہے۔ نکل یہاں سے ابھی نکل "

(زبیدہ رو کر کچھ کہنا چاہتی ہے مگر وہ پھر گر جاتا ہے تو خاموش ہو جاتی ہے۔ زبیدہ کی ماں اس کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔)

بیگم:" زبیدہ ......"

جج:" جانے دو اُسے۔ تم مت جاؤ"

بیگم: (رونے لگتی ہے) " میرے جلے نصیب ـــــ" (بیٹھ جاتی ہے)

نیاز:" اب کیا ہوگا بھائی صاحب۔ لوگ ـــــ"

جج:" میں مار ڈالوں گا اسے اور خود بھی خودکشی کر لوں گا"

نیاز:" مگر بھائی صاحب ذرا سوچئے دُنیا کیا کہے گی "

جج:" میں مرجاؤں گا تو پھر کہنے دو دُنیا کو جو چاہے "

نیاز:" مگر بھائی صاحب اور بھی تو ہیں ——— آخر اور بھی لوگ ہیں جو اس بدنامی کے بعد تباہ ہوجائیں گے۔ جوان لڑکیوں کی شادیاں کیسے ہونگی۔ بیٹے کیسے بیاہے جائیں گے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے "

جج:" تم ہی بتاؤ کیا کروں "

نیاز:" یوں گھبرانے سے کام اور بگڑ جائیگا۔ اب تو شادی کرلی اس نے ——— اور"

جج:" ہیں! تو تمہارا مطلب ہے کہ میں اُسے خوشی خوشی منظور کرکے گلے سے لگالوں!"

نیاز:" اور چارہ ہی کیا ہے۔ بھائی صاحب جب شادی ہوگئی تو اب کیا کیا جا سکتا ہے "

جج:" بالکل نہیں۔ بس۔ میں اس کے گولی مار دیتا ہوں۔ قصّہ پاک ہوجائیگا"

نیاز:" قصّہ پاک نہیں ہوگا۔ بلکہ اور بھی گندہ ہوجائیگا۔ بھائی صاحب ذرا سوچئے۔ میری بچیوں کا کیا ہوگا؟ عابدہ آپا کی بچیوں کا کیا ہوگا؟۔ اقبال اور سعید کیا کریں گے "

جج:" ہوں ——— مگر آہ! موت بس موت ہی باقی رہ گئی میرے لئے تو"

نیاز:" سنئے بھائی صاحب! اب شادی تو ہوگئی۔ مگر ابھی تک دُنیا کو یہ پتہ نہیں کہ وہ بھاگ گئی تھی۔ یا آپ نے ہنسی خوشی شادی کی "

جج:" کیا مطلب؟ تو تمہارے خیال میں اس کنگال سے دو کوڑی کے آدمی سے میں اپنی اکلوتی بیٹی بیاہ دوں؟ "

نیاز:" بیاہ دینے کی بھی خوب رہی۔ اجی بیاہ تو ہو بھی گیا "

جج:" آ۔ ہاں۔ مگر ——— (ایک دم گھبرا کر) ہٹ جاؤ ——— بس اب مجھے

اسے مار ڈالنے دو۔ اسکے سوا کوئی چارہ نہیں۔" (پھر جوش آجاتا ہے)

نیاز:" جلدی نہ کیجئے ـــــ شادی تو ہوگئی۔ اب اگر آپ راضی خوشی ہو جائیں تو"

بیگم:" ہوں۔ میری بچی کو کیا کوئی جَر ملتا نہ تھا جو وہ کنگال کو جائے۔ ارے اُس کیلئے تو ہزاروں ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے۔ تم نہ اپنی مہر وگلّو کو دیدو ـــــ تب میں جانوں"

نیاز:" بھابی جان! میری لڑکیاں آوارہ ہو کر بھاگ جائیں تو میں بیشک ـــــ"

جج:" میں کہتا ہوں اس قطامہ کو گولی مار دینے دو۔"

نیاز:" بیکار ہیں بھائی صاحب آپ تو بس ـــــ ذرا سوچیے کیسی تھُڑی تھُڑی ہوگی۔ اور یوں لوگ کیا کہیں گے؟"

جج:" چولہے میں ڈالو لوگوں کو"

نیاز:" ویسے اُلٹا آپکا نام روشن ہوگا۔"

جج:" وہ کیسے؟"

نیاز:" لوگ کہیں گے اتنے بڑے رئیس ہیں مگر دیکھو ایک معمولی لڑکے کو ہونہار دیکھ کر لڑکی دیدی۔"

جج:" ہوں ـــــ مگر ـــــ"

نیاز:" اور تمام شہروں میں دھوم مچ جائیگی۔ آج ہی میں اخباروں میں نکلوا دونگا کہ "قوم کے ساتھی، فخر اسلام سرہدایت کی فیاضی ـــــ"

جج:" واہیات ہے یہ سب۔ بھلا ایک کنگال کے ساتھ رہ ہی کیسے سکتی ہے زبیدہ۔ وہ استقدر عیش وعشرت میں پلی ـــــ"

نیاز:" تو اچھا ہے۔ اس کو بھی اپنا کیا بھگتنے دیجئے۔ اُس نے خود ہی اپنے پیر میں کلہاڑی ماری۔ کیا ہم نے اُسے کنگال دیدیا؟"

جج :۔ ہوں ــــــ " (سوچتے ہیں)

نیاز :۔ ہاں صاحب - ذرا اطمینان سے سوچئے - ڈنکا بج جائیگا آپ کے نام کا - کتنی زبردست قربانی، کتنا بڑا ایثار - اکلوتی لڑکی کو غریب سے بیاہ دیا - کتنے دریا دل مشہور ہونگے آپ - الیکشن ہیں - آپ کیا سمجھتے ہیں؟ یہی باتیں تو کام آتی ہیں"

جج :۔ ہاں مگر - کہتے تو ٹھیک ہو تم - بلاؤ زبیدہ کو ــــ"

نیاز :۔ ہاں اب آپ یہ کیجئے کہ چپ چپاتے رخصت کردیں - بہت کریں تو عمائدین شہر کو ایک ڈنر یا ایٹ ہوم دیدیں"

بیگم :۔ مگر لوگو غضب ہے کہ نہیں - نیاز میاں میں خوب تمہاری چالیں سمجھتی ہوں - اپنی مہر و گلو کی کردیتے یوں جب میں جانتی بڑے قوم پرست ہو"

جج :۔ چپ رہو جی مت بکواس کرو - تو ہاں میاں نیاز تم کرو انتظام - اور وہ کیا کہا تھا تم نے اخباروں کا"

نیاز :۔ اخباروں کا؟"

جج :۔ ہاں بھئی وہی کچھ چھپوانے کا ہمارے لئے - کچھ وہ قوم وغیرہ کا"

نیاز :۔ ہاں ہاں وہ تو آج ہی لیجئے - وہ آپ کی تصویر بھی ــــ"

جج :۔ ہاں وہ تمغہ والی - اور ہاں وہ ایٹ ہوم - کا بھی - زبیدہ کو بلاؤ - ہم سمجھائیں اسے - اس لڑکے کو بھی بلاؤ - (زبیدہ آتی ہے) تم نے جو کچھ کیا ہم معاف کرتے ہیں"

زبیدہ :۔ "مجھے آپ کی معافی کی ضرورت نہیں"

نیاز :۔ کیا کہتی ہو زبیدہ ــــ قدم پکڑ کر معافی مانگو"

زبیدہ :۔ خاموش رہیئے چچا جان - اوہ مجھے آپ کو چچا جان نہ کہنا چاہئے - نیاز علی!

صاحب۔ آپ دخل نہ دیں"

نیاز "کیا نیاز علی!۔ زبیدہ! تم ——— پاگل ہوگئی ہو"

جج "ہم کہتے ہیں ہم نے معاف کی تمہاری یہ حرکت۔ (ڈانٹ کر غصے سے)

زبیدہ "مجھے نہیں چاہئے آپ کی معافی"

جج "سنو۔ بس چپ چاپ جاؤ اپنے کمرے میں۔ اور کہاں ہے۔ وہ لڑکا۔ نیاز ٹیلی فون کرو کالج۔ اور بلاؤ اُسے"

زبیدہ "میں اِس گھر میں گھڑی بھر نہیں رہ سکتی۔ میں جارہی ہوں اِسی وقت"

جج "شام کو ڈنر کے بعد تم آموں والی کوٹھی میں چلی جانا۔ جاؤ یہ تمہاری حرکت ٹھیک نہیں تھی۔ شادی کرنا تھی تو ———"

زبیدہ "کس کی شادی۔ میری شادی نہیں ہوئی کسی سے"

جج "ہیں ——— کیا ——— شادی نہیں ہوئی؟"

زبیدہ "جی ہاں۔ میں بھاگ آئی اِلہ آباد سے۔

جج "اے لو نیاز میاں ——— یہ تو اربے بھاگ آئی۔ یہ شادی کیسے نہیں ہوئی"

زبیدہ "وہ دغاباز ہے محمود۔ اُس نے مجھے زبردستی روکے رکھا اِلہ آباد میں۔ میں وہاں اپنی ایک سہیلی کے یہاں رہی۔ اور موقع ملتے ہی ———"

جج "موقع ——— ارے! نیاز میاں سُنتے ہو؟"

نیاز۔ (نیاز آتے ہیں) جی ہاں بھائی صاحب بھئی زبیدہ یہ کیا قصہ ہے؟"

زبیدہ "قصہ یہ ہے کہ یہ محمود بہت بدمعاش ہے۔ وہ مجھے زبردستی اِلہ آباد لے گیا۔ اور ——— مگر میں نے شادی سے انکار کردیا"

جج "اور یہ اخبار؟"

زبیدہ "یہ سب جھوٹ ہے ——— اُس پر مقدمہ چل سکتا ہے"

نیاز:" لو! بھئی یہ خوب رہی ـــــ تو شادی نہیں ہوئی"

نج:" ہو گئی اور شادی نہیں ہوئی"

زبیدہ:" جی نہیں۔ اُس نے صرف مجھے ذلیل کرنے کے لئے اخبار میں چھپوا دیا۔ اور آپ ـــ آپ ـــ اوہ ـــــ"

نج:" اب؟ نیاز میاں ـــــ ارے کمبخت تو ـــــ یہ قصہ کیا ہے لو۔ مگر کمبخت تو بھاگ کیوں آئی؟"

زبیدہ:" بھاگ نہ آتی تو کیا اُس دغاباز کے ساتھ چلی جاتی ـــــ میں آگئی خاندان کی خاطر آپ کا نام ذلت سے بچانے کے لئے"

نج:" آ ـــ آ ـــ بھئی ـــ مگر ـــــ اب ـــــ"

زبیدہ:" اب ـــــ اب یہ کہ جہاں میرا منہ اُٹھے گا چلی جاؤں گی۔ میرا اس گھر میں ایک منٹ کے لئے بھی ٹھہرنے کا حق نہیں ـــ اوہ ـــــ"

نج:" مگر نیاز میاں ـــــ یہ ـــ ارے زبیدہ ـــ اُو ـــ اوہ ـ ارے لوگو ـــــ مجھے بندوق لا دو۔ میں اس منحوس لڑکی کا اور اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ اُفوہ میری عزت مٹی میں مل گئی ـــ اوہ ـــــ"

زبیدہ:" بس چپ رہئے۔ میں سمجھتی تھی آپ لوگ میرے والدین ہیں آپ کو میرے ساتھ ہمدردی ہوگی۔ مگر میں نے دیکھ لیا۔ میرا کوئی نہیں۔ آہ ـ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ اوہ" (روتی ہے)

نیاز:" بیٹی زبیدہ ـــــ تم سمجھدار ہو ماشاءاللہ۔ میں نے ٹیلی فون کیا ہے۔ وہ آ رہا ہے۔

زبیدہ:" کچھ نہیں چچا جان! میں آپ لوگوں کو ایسا نہیں سمجھتی تھی ـــــ میں کبھی یہ نہیں سمجھتی تھی کہ یوں میرے ماں باپ بغیر معلوم کئے مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال دیں گے

اور مجھے خوش خوش ایک آوارہ انسان کے سپرد کر دیں گے ۔"

ج ۔" مگر بیٹی ـــــــ جانے دو جو کچھ ہوا ـــــــ دیکھو یہ بات اگر یہیں نہ ختم ہوئی تو بڑی بدنامی ہو گی ۔ میں نے اُسے بھی بلایا ہے ۔ سب بات طے ہو جائے گی ۔"

زبیدہ ۔" پہلے جب آپنے سُنا میں نے شادی کر لی تو آپ کی بدنامی ہونے لگی ۔ جب چچا جان نے ایک چال سمجھا دی تو پھر اب شادی نہ کرنے میں بدنامی ہونے لگی ۔ گویا میں صرف آپکی بدنامی اور نیک نامی کے لئے ایک کھلونا ہوں ۔ جب چاہا بنایا ۔ جب چاہا توڑ دیا ۔"

نیاز ۔" جانے دو زبیدہ ۔ چُپ چُپاتے شادی ہو جائے گی ۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی ۔ دیکھو اسی میں مصلحت ہے ۔"

زبیدہ ۔" اچھی مصلحت ہے آپ لوگوں کی ! میں اس کمبخت سے کبھی بھی شادی نہ کرونگی جس نے مجھے اتنا ذلیل کیا ۔ اس بُری طرح مجھے پریشان کیا ۔ اوہ میں موت کو ترجیح دوں گی ۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا ۔"

ج ۔" تو نیاز میاں ! پھر مقدمہ چلاؤ اُس مردود پر ـــــــ زبیدہ اوہ کاش تو مر جاتی ۔ یا میں مر جاتا ـــــــ"

نیاز ۔" مقدمہ میں کیا رکھا ہے بھائی صاحب ـــــــ اور اب مہرو گلو کی منگنی کا سوال بھی ختم ہوا ۔"

زبیدہ ۔" میری بلا سے ۔ میں جا رہی ہوں ۔ خدا حافظ ۔ امّاں جان ۔ ابا جان ـــــ"

بیگم ۔" بیٹی ۔ ہائے میرے مولا ۔ میری بیٹی ۔"

نیاز ۔" زبیدہ میری بیٹی ۔ میرے بڑھاپے کا خیال کرو ۔ کچھ نہیں تو مہرو گلو کا خیال کرو ۔ رحم کرو بیٹی ۔

زبیدہ " رہنے دیجئے ـــــ (رقّت سے) مجھے جانے دیجئے - ایک مطلبی ہیں آپ "
نیاز " نہیں تم ایسا نہیں کر سکتیں - تم اتنی بے رحم نہیں ہو - زبیدہ - لو میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں "
نج " بیٹی ـــ (پھٹی آواز سے رونے لگتا ہے) بیٹی زبیدہ - بھول جاؤ بیٹی "
زبیدہ " ابّا جان ـــــ " (خوب رونا ہوتا ہے)
نوکر - (آنکر اطلاع دیتا ہے) "ممو میاں آئے ہیں سرکار "
نج " نیاز میاں - لو وہ آگیا "
نیاز " ہاں بھائی صاحب - آپ کچھ فکر نہ کیجئے - سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا - میں اُس سے بات کرتا ہوں "
نج " اور وہ ایٹ ہوم ـــــ دعوتی رقعے ؟ "
نیاز " سب ٹھیک ہو جائے گا "
نج " اور وہ ـــــ کیا کہتے تھے اخباروں میں چھپوانے کا ہمارے لئے "
نیاز - (دور سے جاتے ہوئے) " جی ہاں وہ بھی ـــــ وہ بھی ـــــ "

---

ختم شد

# کلیاں

عصمت چغتائی کے افسانوں میں زندگی کے اُن مسائل کو پیش کیا جاتا ہے جو ہم میں سے ہر شخص کے پیش نظر تو ہوتے ہیں لیکن جن پر غور و خوض کرنے کی ہم میں ہمت نہیں ہوتی۔ عصمت چغتائی نے انہیں نازک مگر اہم مسائل کو اپنے بے لاگ طرز بیان میں افسانوں کے قالب میں ڈھالا ہے۔ عصمت کے افسانے محض دلکش کہانیاں نہیں ہوتے۔ ان میں تلخ حقیقتیں، ہماری معاشرت کے بیہودہ رسم و رواج، ہمارے گھروں کی شرمناک سچی سچی باتیں اور انسانی فطرت کی ان خباثتوں کو عریاں کیا گیا ہے جنہیں سماجی زندگی کی کوڑھ کہنا چاہیئے۔ عصمت ان گندے زخموں کو پھایوں سے نہیں چھپاتی بلکہ ان پر سے پھایوں کو نوچ کر پھینک دیتی ہے اور ایک ہوشیار جرّاح کی طرح اپنے قلم کی سلائی سے زخم کو کُرید کر اس کی تہ تک پہونچ جاتی ہے اور ہمیں بتاتی ہے کہ ناسُور کی اصل جڑ کہاں ہے۔ "کلیاں" میں عصمت چغتائی کے سولہ مضمون ہیں اور ہر مضمون ایک دُکھتا دہکتا ہوا زخم ہے۔ آپ نے ابتک بہت سے ادبی شگوفے دیکھے ہوں گے۔ اب بہ آگ کے پیڑ کی کلیاں بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ضخامت (۴۰۰) صفحے۔ قیمت عہ۔ محصولڈاک ۱۰؍

ملنے کا پتہ:- **ساقی بکڈپو۔ دہلی**

# جدید اُردو ادب

اگر آپ ادبِ جدید کے دلدادہ ہیں اور یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہمارا ادب کس طرح ترقی کر رہا ہے خصوصاً اُردو افسانہ، جو دُنیا بھر کے افسانوی ادب میں اس وقت پیش پیش ہے، کیا ہے اور کیوں اپنا جواب نہیں رکھتا تو رسالہ ساقی دہلی اپنے مطالعہ میں رکھئے۔ افسانوں کے علاوہ جدید شعراء کا تازہ ترین کلام بھی آپ کو صرف ساقی ہی میں مل سکے گا۔ کیونکہ ساقی ادبِ جدید کے علم برداروں کا محبوب رسالہ ہے۔ پُرانا ادب آپ کو کتابوں میں مل سکتا ہے لیکن نیا ادب صرف رسائل ہی میں مل سکتا ہے۔ خصوصاً ساقی میں کیونکہ دورِ حاضرہ کا کوئی صاحبِ طرز ادیب ایسا نہیں ہے جو ساقی سے وابستگی و شیفتگی نہ رکھتا ہو۔ ساقی جدت طرازیوں کیلئے مشہور ہے اور ان جدت طرازیوں میں اُسے ملک کے بہترین دماغوں کی اعانت حاصل ہے۔ ساقی نہایت پابندی وقت کے ساتھ تیرہ ۱۳ سال سے شائع ہو رہا ہے۔

چندہ سالانہ چھ ۶ روپے۔ ششماہی ۳ ہے۔ نمونہ کا پرچہ ۸/

پتہ:۔ رسالہ ساقی۔ دہلی

# مرزا عظیم بیگ چغتائی کی تصانیف

**خانم:-** دیورانی جٹھانی کی پرلطف نوک جھونک کے ۲۵ مزاحیہ افسانے۔ اس کا دیباچہ حجاب امتیاز علی نے لکھا ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت چار روپے۔ (للعہ/)

**کولتار:-** شوخ و شنگ لڑکیوں کی شرارتوں کے افسانے۔ قیمت دو روپے (عگا)

**چمکی:-** مارواڑ کی رومانی سرزمین کا چمکتا ہوا افسانہ قیمت ۱۲/

**روح ظرافت:-** انگوٹھی کی مصیبت اور رسات اور مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت ۸عہ/

**روح لطافت:-** مہارانی کا خواب اور رسات اور دلکش افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت ۸عہ/

**دیکھا جائیگا:-** ایک لڑکی پر تین لڑکے عاشق ہوئے۔ لڑکی کس کو اور کس طرح ملی؟ قیمت عہ/

**کمزوری:-** عورت کی کمزوری کی دلدوز ٹریجڈی۔ ماںتا کی تڑپ۔ قیمت عہ/

**شریر بیوی:-** ایک شریر شوہر اور اسکی شریر بیوی کی پرلطف شرارتیں۔ قیمت ۸عہ/

**سر گزشتہ لے:-** حسن و عشق کی عجیب و غریب داستان۔ قیمت عہ/

**مرزا جنگی:-** قدیم تہذیب لکھنو کا مضحکہ خیز ڈرامہ۔ قیمت ۸/

**آدم خور:-** انسانوں کو کھانے والے انسانوں کے رسم و رواج۔ قیمت ۸عہ/

**لفٹنٹ:-** ایک ہنسانے والا طویل افسانہ۔ قیمت ۶/

**تفویض:-** ایک مسجد کے ملا اور ایک گریجویٹ خاتون کی انمل شادی کے واقعات قیمت ۶/

**خطوط کی ستم ظریفی:-** گمنام خطوط نے ایک عجیب و غریب کہانی بنادی۔ قیمت ۸/

**کھرپا بہادر:-** ایک فرضی ریاست کے مضحکہ خیز واقعات ناول کے پیرایہ میں قیمت عہ/

**جنت کا بھوت:-** ایک حسین لڑکی اور ایک بدشکل لڑکے کی محبت کی داستان قیمت ۱۲/

**ملفوظات حاجی:-** جانوروں کی اگر زبان ہوتی تو وہ کیا کہتے؟ تخیلی افسانے۔ قیمت ۱۲/

**مضامین چغتائی:-** چغتائی صاحب کے متفرق مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ۱۲/

ملنے کا پتہ:- ساقی بک ڈپو - دہلی